سوال جواب

مفتی محمد راشد حسین ندوی

سوال:۔ حسینہ بانو کا شوہر چاند محمد جو کہ ڈرائیورنگ کرتا تھا وہ تقریباً چار سال سے لاپتہ ہے، بہت ڈھونڈھا گیا ملا نہیں ھے، اب حسینہ بانو دوسرا نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:۔ صورت مسئولہ میں حسینہ بانو کو چاہئے کہ اپنا معاملہ کسی دارالقضاء میں داخل کرے، اور پھر جو فیصلہ کیا جائے اس پر عمل کرے، (دارالقضاء ضلع رائے بریلی کے لئے مدرسہ ضیاء العلوم میں قائم ہے، اور مرکزی دارالقضاء دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قائم ہے) دارالقضاء میں معاملہ حل کرائے بغیر وہ دوسرا نکاح نہیں کرسکتی۔

سوال:۔ زید کی بیوی زیتونہ نے زید سے کہا کہ تم مجھے طلاق دے دو تا کہ میں بکر سے نکاح کرلوں، یہ بات زیتونہ نے تین بار کہی اور ڈرایا دھمکایا تو مجبوراً زید نے طلاق دے دی، پھر اس کے بعد بکر نے زیتونہ سے نکاح نہیں کیا تو بتائیں کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب:۔ صورت مسئولہ میں طلاق واقع ہوگئی ہے فقط

سوال:۔ ہندہ کی شادی زید کے ساتھ ہوئی، زید کا دماغی توازن بالکل خراب تھا لیکن اس کا پتہ بعد میں چلا، اس کا دماغی توازن اس قدر خراب ہے کہ وہ پانی پیشاب اور کھانے اور گندگی میں فرق نہیں کرپاتا ہے اور اپنی بیوی کو بے تحاشا مارتا بھی ہے، اسی وجہ سے اب ہندہ اس کے گھر جانے سے انکار کررہی ہے اور والدین سخت پریشانی میں ہیں تو اب جبکہ زید بالکل پاگل ہے کیا کسی صورت میں ہندہ کا نکاح کسی دوسرے سے ہوسکتا ہے؟

جواب:۔ صورت مسئولہ میں اگر زید طلاق دے بھی دے تب بھی واقع نہیں ہوگی، اس سے چھٹکارہ کا طریقہ یہ ہے کہ کسی دارالقضاء سے نکاح فسخ کرالیا جائے، اس کے بعد ہی اس کی شادی کسی اور سے کی جاسکتی ہے (مرکزی دارالقضاء دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اور رائے بریلی کا مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور تکیہ کلاں میں واقع ہے)۔

سوال:۔ ہمارے محلہ میں جو مسجد شہید کر کے دوبارہ بن رہی ہے اس میں مسجد کی پرانی بنیاد سے ہٹ کر محراب کو عمومی گلی میں کردیا گیا ہے جس سے کئی گھروں کا آنا جانا ہے، اس اضافہ کی وجہ سے جو کہ راستہ میں ہے سبھی لوگوں کے آنے جانے میں ہمیشہ تکلیف ہوگی، لہذا ہم لوگ چاہتے ہیں کہ محراب راستہ کے بجائے مسجد ہی کی زمین پر بنائی جائے تا کہ لوگ ہمیشہ کی تکلیف سے بچ سکیں۔

جواب:۔ صورت مسئولہ میں جو بات آپ نے لکھی ہے اگر وہ درست ہے یعنی یہ عمومی گلی جس میں محراب بنائی جارہی ہے مسجد کی ملکیت نہیں ہے عام راستہ ہی اور اس کے بنانے سے لوگوں کا ضرر ہے تو یہ اضافہ کرنا ناجائز ہے۔ (ہندیہ ۲/۴۵۶)

سوال:۔ ہمیں جائداد میں جو حصہ ملا ہے اس کی زکوۃ نہ تو والد محترم نے ادا کی نہ دادا نے، نہ پردادا نے، تو کیا اس کی پوری زکوۃ ہم کو دینا پڑے گی؟

جواب: صورت مسئولہ میں ان اموال میں جن میں زکوۃ واجب ہوتی ہے آپ پر زکوۃ اس وقت سے واجب ہوگی جب سے وہ آپ کی ملکیت میں آئے ہیں۔ (ہندیہ ۱/۱۷۲)

●●

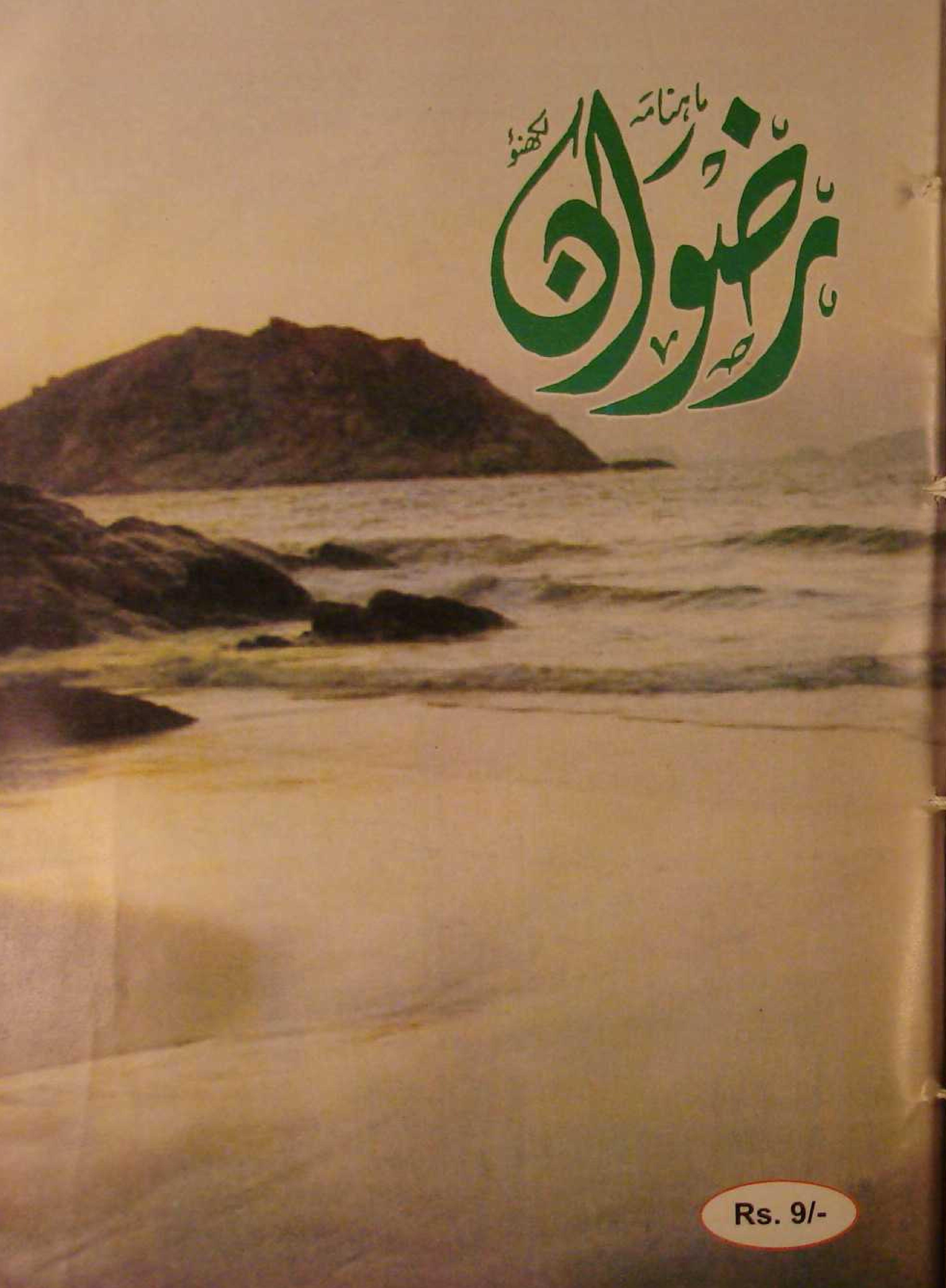

LW/NP – 184 **RIZWAN** R.N. 2416 /57

72/54 Mohammad Ali Lane Gwynne Road Lucknow-226 018

Ph.2270406

حدیث کی مشہور کتاب

ریاض الصالحین

کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ

جس میں وہ روایات ہیں جو فضائل اعمال، اخلاق، اصلاح و تہذیب اور زندگی کے روزمرہ احکام و مسائل سے تعلق رکھتی ہیں

مقدمہ

علامہ سید سلیمان ندوی

زادِ سفر

مترجمہ

محترمہ امۃ اللہ تسنیم (مرحومہ)

یہ کتاب

بہترین مصلح مربّی اور مرشد کا کام کرتی ہے
ہر عنوان کے نیچے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ پھر
احادیث ہیں ذیلی عنوانات جگہ جگہ موضوع کی ہدایت
کرتے ہیں۔ بہترین کتابت
فوٹو آفسیٹ کی طباعت

قیمت حصہ اول / روپے۔ قیمت حصہ دوم روپے

مکتبہ اسلام ۵۴/۷۲ محمد علی لین گوئن روڈ، لکھنؤ (یوپی) ۲۲۶۰۱۸

بیادگار حضرت مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

خواتین کا ترجمان

ماہنامہ رضوان لکھنؤ

جلد ۴۸ نومبر ۲۰۰۴ء شمارہ ۱۱

ایڈیٹر
محمد حمزہ حسنی

معاونین
- اُمامہ حسنی
- میمونہ حسنی
- اسحاق حسینی
- جعفر مسعود حسنی

سالانہ چندہ

برائے ہندوستان	:	۱۰۰؍روپے
غیر ملکی ہوائی ڈاک	:	۲۵؍امریکی ڈالر
فی شمارہ	:	۱۰؍روپے

ڈرافٹ پر RIZWAN MONTHLY لکھیں

ماہنامہ رضوان ۵۴/۲/۱۷، محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸
Phone : 2270406

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد حمزہ حسنی نے مولانا محمد ثانی حسنی فاؤنڈیشن کیلئے کاکوری آفسیٹ پریس میں چھپواکر
دفتر رضوان محمد علی لین سے شائع کیا

کمپوزنگ : ناشر کمپیوٹر لکھنؤ۔ فون : 2281223 - 9415560241

فہرست مضامین

- اپنی بہنوں سے .... مدیر ۳
- حدیث کی روشنی .... امۃ اللہ تسنیم ۴
- دینی سرحدوں کی حفاظت . حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۶
- روزہ کے چند اہم مقاصد .... علامہ سید سلیمان ندویؒ ۹
- اسلامی طرز فکر .... مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۳
- رسول اللہ کی بعثت کا مقصد .... مولانا محمد منظور نعمانیؒ ۱۶
- صحابیات کا بلند کردار .... مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ۱۹
- ماہ شوال کے احکام .... مولانا اشرف علی تھانویؒ ۲۳
- عید الفطر .... چودھری اختر علی ۲۵
- سیدنا حضرت عمرو بن الجموحؓ .... حافظ ارشاد احمد ۲۷
- امام بخاریؒ .... محترم مولانا احمد عثمان محمود ۳۱
- حضرت سید شاہ علم اللہؒ .... مولانا محمد الحسنیؒ ۳۴
- پانی نعمت رب جلیل .... ملک احمد سرور ۳۷
- سوال جواب .... مفتی محمد راشد حسین ندوی ۴۰

اپنی بہنوں سے

مدیر

نومبر کا رسالہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہوگا جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ گزر رہا ہوگا اور عید سعید کی آمد آمد ہوگی، برکت اور خوشی کے اس موقع کی مبارکباد روزہ داروں کو پیش کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ روزوں کو قبول فرمائے اور اس کے لئے مقرر انعامات ہر روزہ دار کو عطاء فرمائے، اور عید سعید کی مسرت اور خوشی بار بار عطاء فرمائے، آمین۔

اس انعام کے دن کی خوشی اور برکت اس وقت دوبالا ہوسکتی ہے اگر ہم اس پر مسرت موقع پر غریب مسلمانوں کو بھی اپنی خوشی اور مسرت میں شریک کرلیں اور ان کو اپنے بہن بھائی سمجھ کر زیادہ نہیں تو تھوڑی توجہ ان پر بھی کرلیں، کہ وہ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہوسکیں اور ان کے گھر بھی شاد و آباد ہوسکیں۔ یہی رمضان المبارک کا اصل پیغام ہے کیونکہ یہ مہینہ غمگساری، مواخاۃ اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے اور اپنے عیش و آرام میں دوسروں کو شریک کرنے، غریبوں، بیواؤں، یتیموں اور ناداروں کی امداد اور ان میں خوشیاں تقسیم کرنے کا مہینہ ہے اور اسی کی تعلیم ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اور آپؐ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک زندگیوں میں ملتی ہے۔

اگر ہم دنیا اور آخرت کی خوشیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارنا چاہئے اور اس مبارک موقع پر خاص طور پر اپنے غریب رشتہ داروں، پڑوسیوں اور یتیموں پر توجہ کرنا چاہئے اور ان ٹوٹے ہوئے دلوں پر محبت و شفقت کی نظر کرنا چاہئے، جن کو سخت حالات زندگی نے زخمی کر رکھا ہے، اور جو دکھ درد کی فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں تو ہم کو رمضان المبارک کی خاص برکتیں اور عید سعید کی حقیقی مسرتیں نصیب ہوں گی۔

امۃ اللہ تسنیم

اللہ کے خوف اور اس کے شوق میں رونا

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝ (بنی اسرائیل: ع ۱۲)

ترجمہ: اور ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور (یہ قرآن) ان کا خشوع اور بڑھا دیتا ہے۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۝ (سورہ نجم: ع ۳)

ترجمہ: سو کیا (ایسی باتیں سن کر بھی) تم لوگ اس کلام (الٰہی) سے تعجب کرتے ہو، ہنستے ہو اور (خوفِ عذاب سے) روتے نہیں ہو۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ قرآن پڑھو، میں نے کہا میں آپ کو پڑھ کر سناؤں آپ پر تو اتارا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے سے سنوں، تو میں نے سورۂ نساء پڑھی اور جب اس آیت پر پہنچا فکیف اذا جئنا من کل امة بشهيد وجئنا بک علی هؤلاء شهيداً آپ نے فرمایا اب بس کرو، میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (بخاری مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ فرمایا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا، فرمایا جو میں جانتا ہوں اگر تم جان لو تو کم ہنسو اور زیادہ روؤ، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہروں کو چھپالیا اور وہ سسکی لے رہے تھے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس دن خدا کے سایہ کے سوا کسی کا سایہ نہ ہوگا اس دن سات آدمیوں پر خدا اپنا سایہ فرمائے گا (۱) منصف بادشاہ (۲) اس نوجوان پر جس نے اللہ کی عبادت میں نشو ونما پائی (۳) اس آدمی پر جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے (۴) وہ آدمی جو اللہ کے لئے محبت کریں (۵) الگ ہوں تو خدا کے لئے اور ملیں تو خدا کے لئے (۶) وہ آدمی جس کو کوئی اعزاز اور حسن والی عورت بلائے تو وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں (۷) وہ آدمی جو اتنا چھپا کے صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا، وہ آدمی جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھیں اشکبار ہوں۔ (بخاری، مسلم)

حضرت عبداللہ ابن شخیرؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نماز میں تھے اور آپ کے پیٹ میں سے رونے کی وجہ سے ہانڈی کی طرح آواز نکل رہی تھی۔

(ابوداؤد، ترمذی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُبی بن کعبؓ سے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو (لم یکن الذین کفروا) پڑھ کر سناؤں، عرض کیا خدا تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا، بخاری میں یہ بھی الفاظ ہیں، (اذکرت عند رب العالمین). ترجمہ: کیا رب العالمین کے دربار میں مجھ جیسے حقیر بندے کا ذکر آیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، تو ابی بن کعبؓ رو دیئے، ایک روایت میں ہے کہ ابی بن کعبؓ رونے لگے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد) کہا کہ چلو حضرت اُم ایمنؓ سے ملاقات کریں، جیسے حضورؐ کرتے تھے، جب یہ دونوں

حضرات وہاں پہنچے تو وہ رونے لگیں، دونوں نے عرض کیا آپ کیوں روتی ہیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہتر ہے، وہ بولیں میں اس لئے نہیں روتی، میں جانتی ہوں جو اللہ کے پاس ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہتر ہے، میں تو اس لئے روتی ہوں کہ وحی آنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا، یہ سن کر وہ دونوں بھی رونے لگے۔ (مسلم)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت جب زور پکڑ گئی اور آپ سے نماز پڑھانے کے لئے کہا گیا تو آپ نے فرمایا ابوبکرؓ سے کہو وہ نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ نے عرض کیا ابوبکرؓ بڑے نرم دل ہیں قرآن پڑھنے سے ان کا دل بے قابو ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا ابوبکرؓ سے کہو نماز پڑھائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت سے کہا کہ ابوبکرؓ جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگ ان کی آواز بھی رونے کی وجہ سے نہ سن سکیں گے۔

(بخاری، مسلم)

حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے سامنے کھانا رکھا گیا وہ روزے سے تھے کہنے لگے مصعبؓ بن عمیر شہید ہو گئے اور وہ مجھ سے بہتر تھے، اتنا کپڑا انہیں تھا کہ وہ اسی میں کفنائے جائیں، ایک چادر تھی اگر سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے، اور پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا، اس کے بعد دنیا کی دولت کی وہ فراوانی ہوئی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اور وہ کچھ ہمیں ملا کر ہم ہی جانتے ہیں، ہمیں یہ ڈر ہے کہ کہیں بھلائی کی سب چیزیں ہمیں یہیں دنیا میں دے دی گئی ہوں (اور آخرت کے لئے کچھ نہ رہا ہو) پھر اتنا روئے کہ کھانا چھوڑ دیا، (بخاری)

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز اتنی محبوب نہیں جتنے دو قطرے اور دو نشان، دو قطروں میں سے ایک وہ قطرہ جو اللہ کی راہ میں بہایا جائے اور دوسرا وہ جو اللہ کے ڈر سے گرے، اور ایک نشان قدم وہ جو اللہ کے راستہ میں ہو اور دوسرا وہ جو اللہ کے فرائض میں سے کسی ایک فرض کے سلسلہ میں لگے۔ (بخاری)

حضرت عمرو بن عوفؓ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو جزیہ لینے کے لئے بحرین بھیجا، وہ بحرین سے مال لے کر آئے، انصار نے سنا کہ حضرت ابوعبیدہؓ آگئے تو وہ صبح کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو گئے، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ سامنے آئے آپ ان کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا میرا خیال ہے کہ تم نے سن لیا۔ ابوعبیدہؓ بحرین سے کچھ لائے ہیں۔ انھوں نے کہا جی ہاں، آپ نے فرمایا مبارک ہو اور خوشی کی امید رکھو، خدا کی قسم میں تمہارے لئے فقر کو نہیں ڈرتا لیکن مجھے خوف ہے کہ تمہارے لئے بھی دنیا اسی طرح نہ پھیلا دی جائے جیسے تم سے اگلوں کے لئے پھیلائی گئی تھی تو جیسے ان کو ہلاک کیا تم کو بھی کہیں نہ ہلاک کر دے۔ (بخاری)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے تھے اور سب آپ کے گرد بیٹھے تھے آپ نے فرمایا مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ میرے بعد تم پر دنیا کی آرائش اور اس کی زینت کھول نہ دی جائے۔ (بخاری)

اور انھیں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا سرسبز اور میٹھی ہے، اللہ تعالیٰ تم کو اس میں جانشین بنائے گا، پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو، تو دنیا میں عورتوں سے ڈرنا۔ (مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ اصلی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ (بخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، اس کا مال، اس کے گھر والے، اور اس کے اعمال...... دو چیزیں پلٹ کر آتی ہیں (۱) گھر والے اور (۲) مال پلٹ آتے ہیں (۳) عمل باقی رہتا ہے۔ (بخاری) ●●

دینی سرحدوں کی حفاظت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران۔ ۲۰۰)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، "وَصَابِرُوْا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، صبر کا ماحول پیدا کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، صبر کی ترغیب دو، "وَرَابِطُوْا" اور جمے رہو سرحد کی حفاظت کرو، سرحدوں پر جمے رہو، "وَاتَّقُوا اللّٰہَ" اور اللہ سے ڈرو، احتیاط سے کام لو، اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر کام کیا کرو، "لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" تاکہ تم کامیاب ہو!

"صبر" کے معنی

اس آیت میں پہلا جو حکم ہے اور جو پہلا خطاب ہے اور جس کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو، "صبر" عربی کا لفظ ہے، اور ایسا ہوتا ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں جاتا ہے اور بہت لمبا سفر کرتا ہے، اور وہ سفر مکانی بھی ہوتا ہے یعنی بہت دور سے آتا ہے وہ لفظ، اور بہت دور تک جاتا ہے، اور وہ سفر زمانی بھی ہوتا ہے کہ کہیں اس کو آج ہزار برس ہو گئے!

اب عربی زبان ہندوستان میں کب آئی تھی اور کب سے یہ لفظ "صبر" کا داخل ہوا اور مسلمانوں کی زبان پر چڑھا، مسلمانوں کے قلم سے نکلا، مسلمانوں کی گفتگوؤں میں آیا، اس کو بھی بارہ سو برس گذرے ہوں گے۔

تو جب کوئی لفظ کسی زبان میں جاتا ہے اور لمبا سفر طے کر کے کسی زمانہ میں پہنچتا ہے، کسی دور کے لوگوں تک پہنچتا ہے، تو اسکے معنیٰ میں کچھ فرق آ جاتا ہے، یا معنیٰ محدود ہو جاتے ہیں، یعنی وہ لفظ بہت وسیع تھا، وہ بہت پھیلا ہوا تھا، اور بڑے میدان کو اور رقبے کو گھیرتا تھا اور سب زندگی کی چیزوں پر، زندگی کے شعبوں پر وہ محیط تھا، اور وہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

"صبر" بھی ان ہی لفظوں میں سے ہے!!

یہ جس کے ساتھ تھوڑی سی حق تلفی، نا انصافی ہوئی مگر اس نے صبر سے کام لیا، اور یہ کہ صبر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اگر کوئی صدمہ پڑ جائے، کوئی حادثہ پیش آ جائے، کوئی نا انصافی ہو، کوئی تکلیف ہو تو زیادہ روؤ دھوؤ نہیں، زیادہ شکایت نہ کرو!۔ لیکن عربی میں "صبر" کے معنیٰ اس سے بہت وسیع ہیں، "صبر" کے معنیٰ ہیں جم جانا، پختہ رہنا، اور مقابلہ کرنا، اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اپنے اصولوں کو نہ چھوڑنا۔ یہ معنیٰ ہیں "صبر" کے عربی میں۔

"صابروا" کی حکمت

اس آیت میں "اصبروا" کے ساتھ "صابروا" کی ہدایت و تلقین کی حکمت اور اس کا راز بڑا غور طلب ہے، اقوام و ملل کی زندگی اور قوموں کے عروج و زوال کے مسئلہ میں صرف انفرادی صبر و استقامت کافی نہیں ہوتی، اجتماعی صبر و استقامت اور ہمت و استقلال کی ایک عام فضا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے کے لئے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر و مستقیم اور دوسروں کے لئے صبر و استقامت کا داعی و مبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان و یقین، اس کا صبر و توکل، اس کا عزم و حوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لئے مشعلِ راہ ہو، اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند و مستحکم ہو جائیں۔ اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل ہو جائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے تردد و تذبذب کے ماحول اور خوف و ہراس کے عالم میں صبر و ہمت کی تلقین اور ثبات و استقامت کی ہدایت۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یا ایھا الذین آمنوا! اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، "اِصبروا" صبر سے اور قوت برداشت سے کام لو۔ اور پھر قرآن کا معجزہ ہے، جو عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ باب مفاعلہ لازم چیزوں کے لئے اور جو ذاتی چیزیں ہیں ان کے ساتھ یہ باب بہت کم آتا ہے، وہ متعدی چیزوں کے ساتھ آتا ہے جیسے "مقاتلہ" ایک دوسرے سے لڑنا، "محاربۃ" ایک دوسرے سے جنگ کرنا، "مناصرۃ" ایک دوسرے کی مدد کرنا، لیکن یہاں "صبر" جو ایک ذاتی فعل اور ایک ذاتی اقدام اور ذاتی طرز عمل ہے، اس کے لئے مفاعلہ کا صیغہ ہے، "وصابروا" اور صبر کی فضا پیدا کرو۔ صبر کی تلقین کرو، قوت برداشت کا مظاہرہ مردانہ وار، بہادرانہ اور صابرانہ طریقے پر تم نے اسے برداشت کیا ہے لیکن اس کو جائز قرار نہیں دیا، ایک برداشت کرنے کے معنیٰ ہماری اردو میں یہ بھی ہوتے ہیں، اچھا بھائی ہو گیا کیا کیا جائے مجبوری ہے، یہ نہیں۔

تم نے اسے برداشت کر لیا، اسے سہہ لیا اور اس کے بعد تم وہی کے وہی رہے، تمھاری قوت ایمانی وہی ہے، تمھارے اعتقادات وہی ہیں، تمھارے توکل علی اللہ کی کیفیت وہی ہے، اور اللہ کو قادر مطلق ماننے کی تمھاری صفت وہی ہے، تو ارشاد ہے "وصابروا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، یعنی صبر کا شامیانہ تمھارے سروں پر چھایا نظر آئے، صبر کے بادل کا سایہ تمھارے سروں پر رہے اور جو دیکھے وہ کہے کہ یہ امت بڑی قوت برداشت والی ہے، اس میں بڑی قوت مقابلہ ہے، لیکن اسے کسی حکمت کی بناء پر اور اللہ کی مدد کے انتظار میں، اور انسانی محبت و برابری کے لئے اور ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے اور حدود سے تجاوز نہ ہو، اس کے لئے، اسے ایک مناسب وقت کا انتظار ہے، یہ نہ سمجھیں کہ اس نے ہماری مان لی، گر گئے، پاؤں کے نیچے پڑ گئے، نہیں "وصابروا" صبر کی فضا چھائی ہو، اور معلوم ہو کہ اس کے اندر بڑی قوت مقابلہ ہے، یہ قوت مقابلہ بیرونی حملوں کے لئے نہیں بلکہ اندرونی حملوں کے لئے بھی ہے، جی اس وقت بھی چاہتا ہے کہ ماریں اور مر جائیں، لیکن انھوں نے اپنے کو قابو میں رکھا ہے، مفاد عامہ ان کے سامنے ہے، ان کے سامنے ملک کی مصلحت ہے، ان کے سامنے پڑوسیوں کے حقوق ہیں، ان کے سامنے ظلم و سفاکی اور خونریزی کی قباحت ہے، ان کو ایمانی طاقت روک رہی ہے، ان کا ایمان ان کو روک رہا ہے، ان کو جو تربیت دی گئی ہے، ان کے سامنے جو اسوۂ رسول ہے، جو صحابہ کا نمونہ ہے، وہ ان کو روک رہا ہے، ورنہ یہ میدان میں آ جائیں، یہ بھی بتا سکتے ہیں، کہ یہ کیا کر سکتے ہیں۔ اور دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک قلیل گروہ نے کیا کیا، اقلیت نے کیا کیا، چند آدمیوں نے کیا کر لیا، ملک کے ملک تباہ کر کے رکھ دیئے، جلا کر کے رکھ دیا، خاک کر کے رکھ دیا، "وصابروا" صبر ہی کافی نہیں تم امت ہو فرد نہیں ہو، تمھارے لئے امت کے احکام ہیں، تمھارے لئے ارشاد خداوندی ہے، فرمان نبویؐ ہے، اسوۂ رسولؐ ہے، تم اپنی مرضی کے مختار نہیں ہو، غصہ آیا جوش آیا، کھڑے ہوئے، قریب کا گھر تھا، پڑوسی کا گھر تھا، اسے جلا دیا، اپنا غصہ نکالنے اور اس کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تم نے اسے جلایا، غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے آگ نہیں لگائی جاتی، غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے زیادہ حکیمانہ، زیادہ مشفقانہ، زیادہ مصلحت اندیشانہ، زیادہ مبصرانہ افعال ہوتے ہیں طرز عمل ہوتا ہے۔

یہ قرآنی اعجاز ہے کہ آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نازل ہوئی ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو۔ "وصابروا" اور جمے رہو، دیوار بنے رہو، ان فسادات، ان نازک حالات، ان حملوں، تعدیوں، دست درازیوں اور خونریزیوں اور اس بہیمیت اور سفاکیت کے مقابلہ میں چھاؤنی بنے رہو۔

حفاظت دین و ملت کا مورچہ

پھر فرمایا "ورابطوا" (اور مورچوں پر جمے رہو)

"رباط" کہتے ہیں ایسی مامون اور محفوظ جگہ کو جہاں لوگ مل جل کر رہیں،

"ورابطوا" اور جمے رہو، اور دیوار بنے رہو، ان کے سامنے تم چھاؤنی معلوم ہو اور پھر آخر میں فرمایا، اور یہی فرق ہے کسی قائد کی تلقین کسی سیاسی رہنما کی تلقین میں، کسی سیاسی مبصر اور فلسفی کی تلقین میں، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلقین میں، کوئی اور ہوتا تو بس یہیں تک کہتا کہ: "یٰا ایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا" اور یہ بھی کہہ دیتا "ورابطوا" اور جمے رہو، سیسے کی دیوار اور پہاڑ بنے رہو، لیکن "واتقوا اللہ" یہ اللہ کہے گا، اور اس کا رسول کہے گا، اور یہ فرق ہے اس دین میں جو اللہ کی طرف سے آیا، اور اس کے پیغمبر نے پہونچایا، اور اس فلسفہ، اس رہنمائی، اس قیادت میں جو انسان اپنے تجربہ، اپنے حالات، اپنی خواہشات، اپنی قوم و جماعت کے مطابق قیادت کا جو نقشہ پیش کرتا ہے، اس میں فرق ہے، کوئی نہیں کہتا سوائے اللہ اور اس کے رسول کے اور اس کے کلام کے "واتقوا اللہ"...... یہ موقع "واتقوا اللہ" کہنے کا تھا، یہ تو صبر کی تلقین کی جارہی ہے، اور صبر کے معنیٰ ہیں کسی نے حملہ کیا ہے، کسی نے زیادتی کی ہے، اور کوئی ہمارے مقابلہ میں ظالم ہے، اس موقع پر نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ سے ڈرو، پہلے کہے، بعد میں کہے، قرآن شریف کی تفسیر میں کہے۔ لیکن ایسے موقع پر کہ ہمارے سامنے ایک طاقت ہو اور وہ طاقت تمام حدود کو پار کر رہی ہو، نہ عورتوں کی عصمت مانع ہے، نہ بوڑھوں اور ضعیف العمر کی ضعیفی مانع ہے، نہ ان کی پیرانہ سالی مانع ہے، نہ پڑوسی کا پڑوس مانع ہے، نہ پڑھے لکھے کا علم مانع ہے، جیسا کہ آپ نے اخبار میں دیکھا اور پڑھا، اس موقع پر "واتقوا اللہ" کہنا، یہ بس خدا ہی کہہ سکتا ہے، اور خدا کا رسول کہہ سکتا ہے اور دنیا میں جتنے لٹریچر ہیں میں ان کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ موقع "واتقوا اللہ" کہنے کا نہیں، یہ موقع تو ہے کہ ان کو سبق دو، ان سے منوالو کہ یہ تمہارے قدموں پر گر جائیں، اور کچھ پرواہ نہ کرو، تمام حدود پار کر جاؤ، جو کچھ کر سکتے ہو کرلو، یہ موقع اس کے کہنے کا تو ہوتا ہے، لیکن یہ شریعتِ الٰہی، تعلیماتِ نبوی، دینِ سماوی کا اعجاز ہے کہ اس موقع پر کہا کہ جب تمہیں موقع ملے تو یاد رکھو "اتقوا اللہ" اللہ سے ڈرو بھی، ان کی طرح تم بے احتیاطی، ان کی طرح تم حدود سے تجاوز، ان کی طرح تم درندگی، ان کی طرح حقائق سے چشم پوشی، ان کی طرح ملک، ماحول و معاشرہ اور بستی، حال و مستقبل اور وقت سے آنکھیں بند کرلینا، یہ تمہارا کام نہیں، "واتقوا اللہ" تم حدود الٰہی اور حدود شرعی کے پابند ہو، اس سے آگے تم نہیں بڑھ سکتے، بس میرے بھائیو! یہ ہمارے لئے پوری تلقین اور ہدایت نامہ ہے۔

"ہم آپ سب قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں، اور قرآن مجید کو خدا کا معجزہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور اللہ کا کلام سمجھتے ہیں، لیکن سب یہ حقیقت نہیں جانتے، اور اس حقیقت کے نہ جاننے سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ علم کے درجے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید مجموعی اور کلی حیثیت سے بھی معجزہ ہے اور جزوی حیثیت سے بھی معجزہ ہے یعنی اس کی ایک ایک آیت معجزہ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے، لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مستقل ایک معجزہ ہے، اور اس کا اعجاز مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے، کہ آفتاب کی مثال دینی بھی بے ادبی ہے اور میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید کی جو آیت پڑھی ہے، بالکل یہ ایک اعجاز کامل ہے۔

...... اس کا حال بھی یہی ہے کہ یہ جب سے نازل ہوئی ہے، کوئی گن نہیں سکتا کہ کب کب اور کیسے کیسے موقعوں پر اور مایوسی کے عالم میں اس نے رہنمائی کی، اور مسلمانوں میں ایک روحانی، جسمانی، قلبی اور ذہنی، فکری اور دعوتی طاقت پیدا کردی۔

اس آیت کو اگر ہم اپنے دل پر رکھ لیں اور ہمارا ذہن اس کو قبول کرلے اور اللہ توفیق دے تو ہر زمانہ کے لئے یہ پورا پیغام رکھتی ہے اور اس زمانہ میں خاص طور سے ایسا معجزہ معلوم ہوتا ہے جیسے اسی زمانہ میں اتری ہو اور اسی زمانہ کے لوگوں سے خطاب ہو۔"

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

روزہ کے چند اہم مقاصد

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ بقرہ : ۲۳

اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

۱- "تقویٰ" دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی ہے اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط پیدا ہوتے ہیں روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے۔

۲- اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ رمہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات میں ایک وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے ان تمام احکام پر نظر ڈالئے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرۃً کمزور یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوا ہے:

وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ۔ (بقرہ : ۲۳)

تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے۔

جو لوگ حج او عمرہ ایک احرام میں ادا کریں جس کو تمتع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے، غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو:

فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ (بقرہ : ۲۴)

تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات گھر آکر۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی جو منیٰ لے جاکر ذبح کی جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو:

اَوْ کَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا۔ (مائدہ : ۱۳)

یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے:

فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ۔ مائدہ : ۱۲)

تو تین دن کے روزے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کرلے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو۔

فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ (مجادلہ : ۱۲)

تو دو مہینے متواتر روزہ۔

اور یہ بھی ممکن نہ ہو :

فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا . (مجادلہ : ۱)

تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ وخیرات، غریبوں کے کھلانے، بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کے قائم مقام ہے۔

۳- روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت، اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی، اور خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا۔ بقول حافظ ابن قیم سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختۂ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو پیدا کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت "بادِرواں" کی طرح ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

۴- انسان کو کتنا ہی نعمت وناز کے گودوں میں پلا ہو، اور مال ودولت سے مالا مال ہوتا ہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی، اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر وضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گو ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش جد وجہد سختی ومحنت کا پوری طرح مقابلہ کرسکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی "صبر" کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہوجائے۔

۵- جس طرح حد سے زیادہ افاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کردیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنادیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے، مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون ومستحب روزے بھی ہیں، مگر اسی کیساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ کتنی بیماریوں کو دور کردیتا ہے۔ بشرطیکہ انہوں نے ازخود کھانے پینے اور افطار وسحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

۶- انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں گزر جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا بند کردے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جاسکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کرکے یہ سعادت

حاصل کی جائے۔

۷- انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل ودماغ تبخیرۂ معدی کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

۸- روزہ بہت سے گناہوں سے انسانوں کو محفوظ رکھتا ہے اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسوئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے، بلکہ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے اگر اس کی سکت نہ ہو :

فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ ، ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَیْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْا اَیْمَانَكُمْ. (مائدہ : ۱۲)

تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔

اسی طرح حج کی حالت شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہوسکے، اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جاسکے تو :

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ، عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ. (مائدہ : ۱۳)

یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے اللہ نے معاف کیا جو ہوچکا۔

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہوجائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو :

فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ . (نساء : ۱۳)

تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کیلئے دو مہینے کے لگاتار روزے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹- اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہوجائے گی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم ومشتعل قویٰ کو، تھوڑی دیر کے لئے سرد کردیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل ودماغ، شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل ودماغ کی جمعیت خاطر، یہ جذبات کا سکون ہوتا۔

ہمارے غور وفکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر، اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لئے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کردیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق وشوق کو اُبھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے اس میں زکوۃ نکالنا مستحب ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی، لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہوجاتی تھی۔

۱۰- ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور

پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض وغایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ کی یہ غرض وغایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ رکھا ہی نہیں گیا، یا یوں کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اس کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا چھوڑ دے"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا، روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہئے کہ لغو اور فحش باتیں نہ بکے، اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے، تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں، بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کردو، صحابہ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے؟ فرمایا جھوٹ اور غیبت سے چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

۱۱- تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۲- اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لئے اپنا کھانا پینا اور ملذات کو چھوڑتا ہے، اسی لئے :

الصوم لی وانا اجزی بہ.

روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزاء دوں گا۔

جزاء تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزاء کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ. (زمر)

صبر کرنے والوں کی مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

۱۳- روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے:

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ.

(بقرہ : ۱۵)

اور مشکلات پر دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات کیلئے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لئے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی کئے گئے ہیں۔

۱۴- یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی اعمال حسنہ میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے :

وَالصّٰٓئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا.

(احزاب : ۵)

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادّی جرائم کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔ ●●

اسلامی طرز فکر

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

عورتوں کی بری عادت

بعض عورتوں نے جو مرید ہونا چاہا تو میں نے ان سے شرط کی کہ دیکھو رسمیں چھوڑنا پڑیں گی کہنے لگی کہ میرے کچھ ہے ہی نہیں۔ بال نہیں بچہ نہیں میں کیا رسمیں کروں گی؟ میں نے کہا، کروگی تو نہیں لیکن صلاح تو دوگی۔ یہ پرانی بوڑھیاں شیطان کی خالہ ہوتی ہیں اگر خود نہ کریں تو دوسروں کو بتاتی ہیں۔ چنانچہ دیکھتا ہوں کہ جن کی اولادیں نہیں ہیں وہ تو خود کچھ نہیں کرتیں لیکن دوسروں کو تعلیم دیتی ہیں۔ کوئی پوچھے کہ اس کو کیا شامت سوار ہوئی ہے اس کو تو یہ مناسب تھا کہ تسبیح لے کر مصلی پر بیٹھ جاتی کچھ فکر تو ہے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب باتوں سے فارغ کیا تھا، وقت کی قدر جانتی مگر یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔

بس یہ مشغلہ ہے کہ کسی کی غیبت کررہی ہیں۔ کسی کو رائے دے رہی ہیں گویا یہ بڑی بختی ہیں بات بات میں دخل دیتی ہیں۔ یاد رکھو زیادہ بولنے سے کچھ عزت نہیں ہوتی۔ عزت اسی عورت کی ہوتی ہے جو خاموش رہے۔ اگر ساکت صامت ہو کر ایک جگہ بیٹھ کر اللہ کا نام لے اس کی تو بڑی قدر و وقعت ہوتی ہے مگر تمباکو کھانے کی جن کو عادت ہو یہ باتیں ان سے کیسے چھوٹ سکتی ہیں؟ خواہ ذلت ہو یا خواری ہو، کوئی ان کی بات بھی کان لگا کر نہ سنے، لیکن ان کو اپنی بڑ ہانکنے سے کام ہے۔ بس عادت پڑ جاتی ہے۔

غرور کی سزا

جیسے نمرود کو جوتیاں کھانے کی عادت پڑ گئی تھی، قصہ یہ ہوا تھا کہ جب نمرود نے خدائی کا دعویٰ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کو بہت سمجھایا مگر نہ مانا اور برابر سرکشی کرتا رہا اور یہ کہا کہ اگر تو سچا ہے تو اپنے خدا کا لشکر منگالے۔ جانتا تھا کہ ان کا معاون و مددگار کون ہے۔ لیکن اسے اپنے لشکر اور خدم وحشم پر گھمنڈ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بوحی الٰہی اس کو اطلاع دی کہ فلاں دن خدائی لشکر آئے گا تو تیار ہو جا۔

چنانچہ اس نے لشکر کو مہیا کیا اور خیال کرتا تھا کہ ابراہیم کا یہ خیال ہی خیال ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں مچھر نے ہر سپاہی کے دماغ میں گھس کر کام تمام کیا۔ نمرود یہ منظر دیکھ کر محل میں گھس گیا اور ایک لنگڑا مچھر اس کی ناک میں بھی گھس گیا اور دماغ پریشان کر دیا۔ اگر سر میں جوتا لگتا تو کچھ چین آ جاتا۔ چنانچہ جو آتا تھا بجائے سلام کے چار جوتیاں اس کے سر پر مارتا تھا۔ حق تعالیٰ نے دکھا دیا کہ تیری شوکت وقوت بس اتنی ہے کہ ایک مچھر نے اور وہ بھی لنگڑا، تجھے پریشان کر ڈالا۔

بعض فارغین کی غفلت

اسی طرح جو مرد یا عورت دین کے رشتے کو چھوڑ کر اپنی خواہشات نفسانی اور خرافات میں مبتلا ہیں اور اس حالت میں وہ خوش ہیں، خدا کی قسم یہ جوتیاں کھانا ہے۔ بعض مردوں کو بھی میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فراغت دی ہے مگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ بس رات دن یہ مشغلہ ہے کہ بیٹھک میں یا کسی دکان پر بیٹھ گئے، کسی کی غیبت کرلی، کسی کے حسب ونسب میں طعن کر دیا، کسی کو صلاح دے دی، کسی کو بڑھا دیا، کسی کو اتار دیا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ اگر تم یہ باتیں نہ کرو تو تمہارا کون سا کام اٹکا ہوا ہے۔ اور اس سے کسی کا نقصان نہیں اپنی ہی زبان اور قلب گندا کرتے ہیں۔ اور

بعض عورتیں خود تو شیطنت سیکھتی ہی ہیں لیکن دوسروں کو بھی سکھاتی ہیں۔ چنانچہ بہو بیٹیوں کو کہتی ہیں بٹی تجھ کو گھر برتنا ہے سب کام آنکھوں میں نکالا کرتے ہیں (یعنی سب کام سیکھنے چاہئیں)۔ ان کو تو اپنی آزادی پر بہت شکر کرنا چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب قصوں سے آزاد رکھا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آزاد کی حکایت لکھی ہے کہ سفر حج میں پیادہ جا رہا تھا اور یہ شعر پڑھتا تھا:

نہ بر اشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

کہ میں نہ اونٹ پر سوار ہوں اور نہ اونٹ کی طرح لدا ہوا ہوں اور نہ رعیت والا ہوں اور نہ بادشاہ کا غلام ہوں۔ بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اولاد سے آزاد رکھا ہے خاص کر آج کل کی اولاد کہ ان سے تو بجز اس کے اپنا وقت اور دین برباد ہو کچھ نفع نہیں ہے۔ ہاں اگر اولاد دین میں مدد دے تو سبحان اللہ۔

ایک بزرگ کا قصہ

ایک بزرگ نکاح نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سو رہے تھے۔ دفعۃً چونک پڑے اور کہنے لگے کہ جلدی کوئی لڑکی لاؤ۔ ایک مخلص مرید حاضر تھے۔ ان کی ایک لڑکی کنواری تھی۔ جا کر فوراً حاضر کیا۔ اسی وقت نکاح ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بچہ دیا اور وہ مر گیا۔ بی بی سے کہا کہ بی بی جو میرا مطلب تھا وہ پورا ہو گیا۔ اب تجھ کو اختیار ہے اگر تجھ کو دنیا کی خواہش ہے تو میں تجھ کو آزاد کر دوں، کسی سے نکاح کر لے اور اگر اللہ کی یاد میں اپنی عمر ختم کرنا ہو تو یہاں رہو۔ چونکہ وہ بی بی ان کے پاس رہ چکی تھی اور صحبت کا اثر اس کے اندر آ گیا تھا، اس لئے اس نے کہا کہ میں اب کہیں نہیں جاتی۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی اللہ کی یاد میں رہے۔ ان کے بعض خواص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات تھی۔ فرمایا: بات یہ تھی کہ میں سو رہا تھا میں نے دیکھا کہ میدان محشر ہے اور پل صراط پر لوگ گزر رہے ہیں۔ ایک شخص کو دیکھا کہ اس سے چلا نہیں جاتا۔ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے۔ اسی وقت ایک بچہ آیا اور ہاتھ پکڑ کر آناً فاناً اس کو لے گیا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ اس کا بچہ ہے جو بچپن میں مر گیا تھا، یہاں اس کا رہبر ہو گیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور مجھے خیال ہوا کہ میں اس فضیلت سے محروم نہ رہوں۔ شاید بچہ ہی میری نجات کا باعث ہو جائے اس لئے میں نے نکاح کیا تھا اور میرا یہ مقصود حاصل ہو گیا۔

بچپن میں بچے کا مرنا بھی نعمت ہے

بتائیے اب بھی کوئی ایسا ہے کہ بچے کے مرنے کو مقصود کا حاصل ہونا سمجھتا ہو۔ اب تو اگر کسی کا کوئی بچہ مر جاتا ہے تو پیٹ پھاڑ پھاڑ کر مر رہتے ہیں۔ یہ اہل اللہ ہی کی ہمت ہے، پس اگر اولاد مر کر یا زندہ رہ کر آخرت کا ذخیرہ ہو تو ایسی اولاد تو بڑی نعمت ہے ورنہ وبال جان ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچے کو قتل کر دیا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہ ایک بے گناہ بچے کو مار ڈالا؟

اور خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے کے وقت یہ شرط کر لی تھی کہ میرے کسی فعل پر اعتراض نہ کرنا، اس لئے انہوں نے فرمایا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم سے صبر نہ ہو سکے گا۔ اس کے بعد اس واقعے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ اس لڑکے کے والدین مومن ہیں اور یہ لڑکا بڑا ہو کر کافر ہوتا، اور اس کی محبت میں ماں باپ بھی کافر ہو جاتے۔ اس لئے ارادۂ الٰہی یہ ہوا کہ اس کا پہلے ہی کام تمام کر دیا جائے۔ اور اس کے بدلے نیک اولاد ان کو ملے۔

اس قصے سے معلوم ہوا کہ جو بچے بچپن میں مر جاتے ہیں ان کا مر جانا ہی بہتر ہوتا ہے اسی واسطے جو دین دار ہیں ان کو اولاد کے مر جانے کا غم تو ہوتا ہے لیکن پریشان نہیں ہوتے۔ جو شخص خدا تعالیٰ کو حکیم سمجھے گا وہ کسی واقعے پر کبھی پریشان نہ ہوگا، ہاں جس کی اس پر نظر نہیں اس پر اگر کوئی واقعہ ہوتا ہے مثلاً کوئی بچہ مر جاتا ہے تو

اس کو بڑا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے کہ اگر زندہ رہتا تو ایسا ہوتا۔ دل کے اندر سے شعلے اٹھتے ہیں، ارمان آتے ہیں، حسرتیں ہوتی ہیں کہ ہائے ایسی لیاقت کا تھا، ایسا تھا، ایسا ہو جاتا۔ صاحبو! تم کو کیا خبر ہے کہ وہ کیسا ہوتا۔ غنیمت سمجھو اسی میں مصلحت تھی۔ ممکن ہے کہ بڑا ہو کر کافر ہوتا اور اس کو بھی کافر بنا دیتا۔

بعض کے لئے اولاد نہ ہونا بھی نعمت ہے

اب لوگ تمنا کرتے ہیں اولاد کی، یاد رکھو جس طرح اولاد ہونا نعمت ہے اسی طرح نہ ہونا بھی نعمت ہے بلکہ جس کے نہ ہوئی یا ہو کر مر گئی ہو اس کو اور بھی زیادہ شکر کرنا چاہئے۔

بعضوں کے لئے اولاد عذاب جان ہو جاتی ہے، جیسے منافقین کے بارے میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان کے مال اور اولاد اچھے نہ معلوم ہوں۔ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ ان مالوں اور اولادوں کی وجہ سے ان کو اس دنیا کی زندگی میں عذاب دیں۔

واقعی بعضوں کے لئے اولاد وبال جان ہی ہو جاتی ہے۔ بچپن میں تو ان کے گو موت میں نمازیں برباد کرتے ہیں۔ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے لئے اور طرح کے افکار ہوتے ہیں کہ ان کے لئے جائداد ہو، روپیہ ہو، گھر ہو، خواہ دین رہے یا جائے، لیکن جس طرح بنے گا ان کے لئے دنیا سمیٹیں گے۔ اور ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہیں گے اور حلال و حرام میں کچھ تمیز نہ کریں گے۔ پس ایسی اولاد کا نہ ہونا ہی نعمت ہے۔ اگر اولاد نہ ہوتی تو واللہ اعلم ان کی کیا حالت ہوتی۔ ایسے لوگوں کو تو بس یہ مناسب ہے کہ کسی کی بات میں نہ بولیں، خاموش بیٹھے اللہ اللہ کئے جائیں عورتیں اس کو سن کر کہا کرتی ہیں کہ بیٹھ تو جائیں کوئی چین بھی لینے دے۔ میں کہتا ہوں کہ تم اپنے منہ کو جب گوند لگا کر بیٹھو گی تو کسی کا سر پھرا ہے جو تم سے مزاحمت کرے۔ زیادہ فساد اور گناہ اس بولنے سے ہی ہوتے ہیں۔

خاموشی میں عافیت ہے

حدیث میں ہے "من سکت سلم" جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔ ایک شہزادہ حدیث کی کتاب پڑھا کرتا تھا۔ جب یہ حدیث پڑھی استاد سے کہا، جناب بس میں آگے نہیں پڑھتا۔ جب اس پر عمل کر لوں گا اس وقت آگے چلوں گا اور اسی وقت سے بولنا چھوڑ دیا۔ بادشاہ کو بڑی فکر ہوئی۔ سمجھے کہ لڑکے کو آسیب ہو گیا ہے۔ عامل اور تعویذ گنڈا کرنے والے جمع ہوئے۔ سب نے تدبیریں کیں۔ اطباء بھی جمع ہوئے۔ یہ رائے ہوئی کہ ان کو شکار میں لے چلنا چاہئے، وہاں تفریح ہوگی، طبیعت درست ہو جائے گی۔ چنانچہ گئے اور شکاری تیر اور بندوق لے کر چلے کہ اس سے شاید تفریح ہو۔ شکاری جانوروں پر تیر چلانے لگے۔ اتفاق سے ایک جھاڑی کے پیچھے ایک تیتر چھپا ہوا تھا۔ وہ بولا، بولتے ہی اس کے تیر لگا۔ شہزادہ یہ دیکھ کر بولا کہ کمبخت نہ بولتا نہ مارا جاتا۔

شہزادے کی اتنی بات سن کر مبارک بادی کا غل پڑ گیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ بادشاہ نے پھر چاہا کہ شہزادہ کچھ بولے مگر نہ بولا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ باندھ کر اس کو مارو۔ شہزادہ دل میں کہتا تھا کہ ایک دفعہ بولنے سے تو مجھ پر یہ آفت آئی ہے اگر پھر بولوں گا تو جانے کیا ہوگا؟ اس کے بعد تمام عمر کسی سے نہ بولا۔

خلاصہ وعظ

واقعی زیادہ گناہ ہم لوگوں سے اس زبان ہی کی بدولت ہوتے ہیں خصوصاً عورتوں کو تو اس قدر شوق بولنے کا ہے کہ جب بیٹھیں گی وہ چرخہ چلاویں گی کہ ختم ہی نہیں ہوگا، خدا جانے ان کی باتیں اتنی لمبی کیوں ہوتی ہیں اور جب یہ باتوں میں

بقیہ صفحہ (۱۸) پر

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد

آپ اس سے تو یقیناً واقف ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ اس لئے نہیں آئے تھے کہ دنیا کی قوموں میں مسلمان نام کی ایک نئی قوم کا اضافہ کردیں۔ بلکہ آپ انسانی دنیا کے لئے زندگی کا ایک خاص نظام لے کر آئے تھے۔ اس نظام کے خاص عناصر اور خاص عنوانات یہ تھے۔ اللہ پر اور آخرت کی جزا وسزا پر ایمان و یقین، اچھے اعمال اور پاکیزہ اخلاق اور دنیا میں نیکی کو رائج کرنے کے لئے مخلصانہ فکر و کوشش۔ زندگی کے اسی نظام کا نام اسلام تھا اور یہ دنیا کے لئے کوئی نیا اور نرالا نظام نہ تھا، بلکہ اصولی اور بنیادی طور پر یہ وہی نظام تھا جس کی دعوت آپ سے پہلے آنے والے اللہ کے سب پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانے میں انسانوں کو دی تھی، بہر حال رسول اللہ ﷺ اس نظام زندگی کو آخری اور مکمل شکل میں لے کر آئے۔ اور آپ نے پیغمبر ہوکر تشریف لائے تو پیغمبروں کا نام لینے والی چند قومیں یہاں موجود تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت موجود تھی۔ حضرت عیسیٰ کی امت موجود تھی۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل کے نام لیوا بھی موجود تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے پاس وہ زندگی نہیں تھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام اپنے اپنے وقت پر لے کر آئے تھے۔ ایمان اعمال اور اخلاق سب کا نقشہ بگڑا ہوا تھا اور اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سب خدا کو بھولے ہوئے تھے آخرت کی جزا وسزا کی طرف سے سب بے فرک اور غافل تھے، اس لئے اعمال گندے اور اخلاق درندوں کے سے تھے۔ بہر حال اس بگڑی ہوئی حالت میں اور اس اندھیری فضا میں سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنا کر بھیجے گئے۔ آپ نے اللہ پر اور آخرت کی جزا و سزا پر ایمان لانے کی اور اچھے اعمال و اخلاق اختیار کرنے کی دعوت دی اور ایمان اور اعمال و اخلاق کا ایک مکمل اور تفصیلی نقشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ میں نے جیسا کہ ابھی عرض کیا تھا کہ اسی نقشے کا نام اسلام تھا اور آپ کا اصلی کام زندگی کے اسی نظام اور نقشے کی دنیا کو دعوت دینا اور اس کو پھیلانا اور رواج دینا تھا۔ آپ نے اس وقت کی دنیا کے سامنے اس کو پیش کرتے ہوئے اس کے نازل کرنے والے پروردگار کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا کہ زندگی کا صرف یہی نقشہ اس کے ہاں مقبول اور پسندیدہ ہے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے والے ہی اس کے وفادار اور اس کی رحمتوں کے مستحق بندے ہیں اور اس کے سوا اور اس سے مختلف زندگی کے جتنے نقشے ہیں وہ سب اس کے ہاں مردود اور مبغوض ہیں۔ اس لئے اس کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ اس کے تجویز کردہ اور نازل کئے ہوئے اس طریقۂ زندگی کو اپنائیں گے جو میں لے کر آیا ہوں اور اس پر چلیں گے ان کو اللہ کی خاص رضا نصیب ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرنے کے بعد والی آخرت کی اس زندگی میں جو کبھی ختم نہ ہوگی وہ انتہائی درجے کے عیش و آرام میں رہیں گے اور اس دنیا میں بھی ان پر ان کے مالک کا خاص فضل ہوگا اور جب اس طریقے پر چلنے والوں کی یعنی ایمان، اعمال و اخلاق کے اس خداوندی نقشے پر زندگی گزارنے والوں کی کوئی قوم اور امت اس دنیا میں ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو اس دنیا کا انتظام بھی سپرد فرمائیں گے اور یہ دنیا گویا اس کے چارج میں دے دی جائے گی۔

جس وقت آپ نے دنیا کے سامنے زندگی کا یہ نیا نقشہ پیش کیا اور لوگون کو اس کی دعوت دی اس وقت اس پوری دنیا میں کوئی بھی اس نقشے پر چلنے والا نہیں تھا۔ بس آپ اکیلے ہی اس طریقے پر زندگی گزارنے والے تھے پھر آپ کے زمانے کے کچھ نیک بخت لوگون نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ کچھ عرصے کے بعد اس طریقۂ زندگی کو قبول کرنے والوں اور اس پر چلنے والوں کی ایک چھوٹی سی امت یا جماعت بھی وجود میں آ گئی۔ اس وقت یہ جماعت بس مدینہ کی بستی میں اور اس کے قرب و جوار کی چھوٹی آبادیوں میں تھی۔ گویا پوری دنیا کے بحر ظلمات اور اندھیرے سمندر میں یہ چھوٹا سا نورانی جزیرہ تھا، جس کی زندگی کا نقشہ ساری دنیا کی آبادیوں سے بالکل مختلف تھا، یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اور آپ سے تعلیم و تربیت پائے ہوئے مسلمانوں کی مختصر سی جماعت تھی، تاریخ میں اس جماعت کی زندگی کا نقشہ اس طرح محفوظ ہے کہ آپ اس وقت رات ہونے کے باوجود جس طرح بجلی کی روشنی میں مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں آپ کو دیکھ رہا ہوں اسی طرح تاریخ کی روشنی میں ہم آج بھی چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود اس جماعت کی زندگی کے نقشے اور اس کے خد و خال کو دیکھ سکتے ہیں، بلکہ دیکھ رہے ہیں۔ ان سب کا حال یہ تھا کہ خدا کے خوف اور آخرت کی فکر کا عنصر ان کی زندگی میں ہر دوسری چیز پر غالب تھا، یہ ہر معاملے میں اپنے دل کی خواہش اور رچاہت یا اپنی ذاتی منفعت و مصلحت کے بجائے خدا کے حکم کو دیکھتے تھے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ان کے اخلاق انبیاء علیہم السلام کے اخلاق کا نمونہ تھے دنیا میں بھلائی پھیلانے کے لئے اور بگڑے ہوئے انسانوں کو اللہ کا نیک بندہ بنانے کیلئے اور خدا سے بچھڑے ہوؤں کو خدا سے ملانے کے لئے اور جنت تک پہنچانے کیلئے ہر طرح کی تکلیفیں اٹھانا اور مصیبتیں جھیلنا ان کا خاص کردار اور شعار تھا بس یہ ان کی زندگی تھی اور اس زندگی کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا اگرچہ ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ آج ہندوستان جیسے ایک غیر اسلامی ملک کے ایک ایک شہر میں بھی اس سے زیادہ مسلمان موجود ہیں جتنی کہ اس وقت مسلمانوں کو کل آبادی تھی اور اسی طرح ان کے پاس دولت کی بھی اتنی کمی تھی کہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت کے تمام مسلمانوں کی مجموعی دولت مل کر بھی اتنی نہ تھی جتنی آج ہمارے ایک ایک دولت مند مسلمان بھائی کو اللہ نے دے رکھی ہے اور اسی طرح علم و ہنر اور قوت و طاعت کے دوسرے ظاہری اسباب سے بھی وہ خالی تھے مگر چونکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی زندگی کو اپنا لیا تھا اور اس طرح اللہ کی خاص رضا اور نصرت و اعانت کا استحقاق پیدا کرلیا تھا اس لئے تعداد اور دوسرے مادی وسائل کی اتنی کمی کے باوجود وہ اس وقت کی دنیا کے مقابلے میں بھاری اور وزنی تھے اور دنیا ان کے آگے جھکنے پر مجبور تھی۔

اس سے میرا اشارہ ان ملکی فتوحات اور بالاتری کی طرف نہیں ہے جو قرنِ اول کے ان مسلمانوں کو ہوئی تھیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح اور پیغمبروں کے طریقے پر انسانیت کی مخلصانہ خدمت اور رہنمائی کی وجہ سے اس وقت کی دنیا میں وہ سب سے ممتاز اور سب سے زیادہ اثر ان کے فیصلوں کا پڑا۔

رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی کچھ عرصے تک امت کی زندگی کا نقشہ یہی رہا لیکن کچھ اور زمانہ گزرنے کے بعد زندگی کے اس نقشے میں فرق پڑنا شروع ہو گیا ایمان و یقین میں کمزوری آئی اعمال میں بھی فرق آیا اور اس کے نتیجے میں ان کے ساتھ اللہ کے معاملے میں فرق آ گیا پھر یہ فرق برابر بڑھتا گیا اور اسی تناسب سے امت کے حالات بگڑتے رہے یہاں تک کہ تیرہ

صدیوں کے بعد آج مسلمان کہلانے والی وہ امت اس حال میں ہمارے اور آپ کے سامنے ہے اور صورت یہ ہے کہ اس کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے جس کا قرن اول کے مسلمانوں نے غالباً کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا لیکن جو زندگی حضور ﷺ لے کر آئے تھے اور جس کی بنیاد پر مسلمان دنیا میں بنے تھے اور جس کے صدقے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و نصرت حاصل تھی وہ اس وقت چھوٹی سے چھوٹی کسی مسلمان بستی کی بھی زندگی نہیں ہے۔

آج مسلمان کہلانے والوں کی غالب اکثریت کے اس قلب ایمان و یقین سے خالی ہیں جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے اس کے بجائے بس ایک کمزور اور بے جان سا عقیدہ۔ اور زبانی اقرار رہ گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دلوں میں خوف نہیں زندگی میں آخرت کی فکر نہیں، اعمال اسلامی نہیں اخلاق اسلامی نہیں، معاملات اسلامی نہیں، الغرض اسلام کے اقرار و اعتقاد کے باوجود ظاہری اور باطنی زندگی اسلامی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ جو زندگی لائے تھے اور جس کی دعوت دیتے تھے اور جس کا نام اسلام تھا وہ پوری قرآن مجید میں اور آپ کی سنت میں ہے ایک طرف اس کو دیکھئے اور دوسری طرف مسلمان قوم کی موجودہ زندگی کو، کوئی بھی دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کوئی مناسبت اور مطابقت ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عام مسلمانوں کی جو زندگی ہے رسول اللہ ﷺ ایسی زندگیوں کو تو مٹانے تشریف لائے تھے اس وقت ہماری بدبختی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ امت کی اکثریت کی زندگی وہی زندگی ہے اور دلوں میں اس پر کوئی بے چینی اور کوئی خاص خلش بھی نہیں ہے۔

●●

اسلامی طرز فکر............کا بقیہ

مشغول ہوتی ہیں تو ان کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بس یہ باتوں ہی کو مقصود اصلی سمجھتی ہیں۔ وہ مزہ لے لے کر باتیں کرتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترس ترس کر ان کو یہ دولت ملی ہے۔ بخلاف مردوں کے کہ ان کی باتوں اور تمام اشغال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ختم کر کے وہ دوسرے کام میں لگنا چاہتے ہیں۔ خدا کے واسطے اپنی عقل درست کرو۔

پس ولھا یجمع من لاعقل له سے یہی مراد ہے اور نفس مال مراد نہیں ہے۔ اور میرے اس بیان سے اولاد والے اور تعلقات والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو معذور ہیں۔ یاد رکھو آپ نے بھی فضول تعلقات بڑھا رکھے ہیں اور وہ ایسے تعلقات ہیں کہ جب چاہو، گھٹا سکتے ہو۔ ہاں جو ضروری ہیں وہ تو حقوق ہیں ان میں مشغول ہونا تو عبادت ہے۔

پس جو تعلقات دنیا ہیں اس کے قطع کے آپ بھی مخاطب ہیں۔ میرا مطلب تقریر سابق سے یہ نہ تھا کہ آپ معذور ہیں۔ آپ ہرگز معذور نہیں ہیں۔ میرا مقصود یہ تھا کہ تعلق والوں کو تو ان کے نزدیک ایک ایک عذر بھی ہوسکتا ہے، گو ہونا مسموع نہ ہو، اور جن کے کچھ نہیں ان کے پاس تو یہ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلقات والے اور بے تعلق والے سب دنیا کے تعلقات چھوڑنے کے مخاطب ہیں۔ پس یہ مضمون تھا جو اس وقت مجھ کو بیان کرنا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون کو مرد اور عورتیں سب یاد رکھیں گے اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیں گے۔ آج کل مشکل یہ ہے کہ آنسو بہالیں گے، آہیں بھرلیں گے اور سن کر کہیں گے کہ بس جی ہمارا کیا ٹھکانا ہے۔ صاحبو! ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔ کام تو کرنے ہی سے ہوتا ہے۔ پس کام کرو اور باتیں نہ بگھارو۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ توفیق عطا فرمادے۔ (آمین)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صحابیات کا بلند کردار

مردوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کا تعاون بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر دنیا کے بہت سے کام مکمل طریقے سے انجام نہیں دیئے جاسکتے۔ البتہ اس تعاون کی حدود مقرر ہیں جن سے خواتین کو باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ لیکن ان حدود کے اندر رہ کر وہ زندگی کے مختلف شعبوں کو فائدہ پہنچاسکتی ہیں۔ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں عورتوں نے اپنی حدود اور جائز پابندیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے زندگی کے مختلف کاموں کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ سیرت رسول علیہ السلام کے مطالعے سے بھی اس کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں۔

بعض موقعوں پر تو ان کا کردار اس قدر بلند اور نمایاں نظر آتا ہے کہ بہت سے مرد بھی اس سلسلے میں ان کی ہم سری نہیں کرسکتے۔ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگیاں اس کی مثالوں سے پر ہیں، اس کے علاوہ اسلام کے پھیلانے اس پر ثابت قدمی دکھانے، جہاد میں ضمنی کاموں کو انجام دینے اور مردوں کو نہایت دانش مندانہ مشورہ دینے میں خواتین کا پایہ بہت بلند ملتا ہے۔ اسلام پر ثابت قدمی کا یہ حال تھا کہ حضرت عمارؓ بن یاسر اور ان کے والد اور والدہ کو اسلام لانے پر اس قدر ایذا دی جاتی تھی کہ اس کے منظر کی تاب لانا بھی مشکل تھا، لیکن ان کا خاندان اس کے باوجود اسلام پر جما رہا، اس وقت کے حالات میں ان کی کوئی مدد نہیں پہنچائی جاسکتی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب ان کے سامنے سے گزرتے تو صرف اس قدر فرماتے ہوئے گزرتے تھے کہ اے یاسر کے خاندان والو! صبر کرو جنت ملے گی، ان لوگوں نے واقعی صبر کیا حضرت عمار کی والدہ کو اسلام سے پھیرنے کی کفار نے انتہائی کوشش کی اور برابر ایذا پہنچاتے رہے لیکن انہوں نے ان کی بات نہ مانی اور تکلیف جھیلتے جھیلتے جان دے دی۔

زندگی کے ہر شعبے میں خواتین اسلام کی پختگی، دانش مندی اور بہادری کے صدہا ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ایک طرف عورتوں کا پایہ نہایت بلند معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف آنے والی نسلوں کے لئے وہ بہترین نمونہ نظر آتی ہیں۔

عہد اول میں بھی عورتوں کی خدمات بڑی قیمتی نظر آتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مطالعے سے یہ صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ اسلام کی تائید و نصرت میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے اور بعض موقعوں پر تو انہوں نے نہایت پیچیدہ صورتوں کو محض اپنی فہم و دور اندیشی یا جرأت و ہمت سے حل کیا۔

جس وقت حضور ﷺ کو نبوت و رسالت کی عظیم ذمہ داری سپرد کی گئی اس وقت صرف دو تین ہی شخصیتیں ایسی تھیں جنہوں نے حضور ﷺ کو اس عظیم ذمہ داری کو سنبھالنے اور نبوت کے اس عظیم بوجھ کے اٹھانے میں نہایت بیش بہا مدد دی ان دو تین ممتاز شخصیتوں میں حضرت خدیجہؓ کا اسم گرامی سب سے مقدم ملتا ہے۔

حضور ﷺ غار حرا سے واپس تشریف لاتے ہیں۔ آپ کے کاندھوں پر نبوت کا وہ زبردست بوجھ ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے آپ کے اوپر رکھا گیا ہے، آپ اپنے کو اس بوجھ کے ساتھ دنیا کے زبردست انسانی کنبے میں تنہا اور اپنے شانوں کو اس بوجھ کے اٹھانے سے کمزور محسوس کر رہے ہیں۔ اس حال میں آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے ہیں اور ان کے سامنے صورت حال رکھتے ہیں، وہ اطمینان

دلاتی ہیں اور پوری ہمدردی کرتی ہیں جب آپ پر وحی آتی تھی تو آپ پر اس کا اس قدر بوجھ پڑتا تھا کہ جاڑوں کے موسم میں بھی پسینا آجاتا تھا، جب آپ پر پہلی بار وحی آئی اور آپ گھر لوٹے تو آپ نے حضرت خدیجہؓ کو سارا واقعہ سنایا، پھر فرمایا مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا وجہ یہ تھی کہ آپ نے ایسی بات دیکھی جو اس سے قبل نہ دیکھی تھی اور نہ آپ کے خیال میں گزری تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ سے کہا کہ یہ آپ کو مبارک ہو۔ اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو رشتوں کو جوڑتے ہیں، مہمان کی ضیافت کرتے ہیں اور گردش روزگار میں مصیبت زدہ لوگوں کے کام آتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں تاکہ وہ آپ کے معاملے میں رائے دیں کیونکہ ان کو سابقہ مذاہب کا اچھا علم تھا پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے صرف ورقہ بن نوفل سے دریافت کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صورت حال کا خود بھی مطالعہ کیا اور آپ کی نبوت کی حقانیت کو خود سے سمجھنے کا ارادہ کیا۔

آپ نے حضور ﷺ سے کہا کہ یہ جو شخص آپ کے پاس وحی لے کر آتے ہیں وہ جب آئیں تو مجھے مطلع کیجئے گا۔ بہر حال جب حضرت جبرئیل حضور ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے حضرت خدیجہؓ کو مطلع کیا، انہوں نے آپ کو اپنے سے مل کر بیٹھ جانے کو کہا، پھر اس سے اور زیادہ قریب ہو جانے کو کہا۔ حتی کہ جبرئیل وہاں سے ہٹ گئے، جب حضور ﷺ نے ان کو بتایا کہ حضرت جبرئیل ہٹ گئے تو انہوں نے کہا کہ اب آپ اپنے پر جم جایئے اور خوش ہو جایئے کیونکہ یہ آنے والا فرشتہ ہے۔ کوئی بدروح نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغام کے پھیلانے پر گامزن رہے اور اس سلسلے میں اپنی قوم کی مخالفت اور ہر طرح کی ایذا رسانی برداشت کرتے رہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نہ صرف یہ کہ آپ پر سب سے پہلے ایمان لائیں بلکہ آپ کے کام میں آپ کی پوری مدد بھی کرتی رہیں، ان کے تعاون و دل داری سے حضور ﷺ کی بہت کچھ تکلیف کم ہو جاتی تھی، جب آپ کسی مشرک سے برا اور سخت جواب یا انکار سن کر بہت زیادہ متاثر اور غمگین ہو کر گھر تشریف لاتے تو حضرت خدیجہؓ آپ کی دل داری اور آپ کے تاثر کو ہلکا کرتیں، آپ کی تائید و تصدیق کرتیں اور لوگوں کی بے رخی و بدمعاملگی کو آپ کے دل سے ہلکا کرتی تھیں۔

یہ درحقیقت بہت بڑی خدمت تھی جس کا اعزاز اس امت مسلمہ میں کسی بھی خاتون کو حاصل نہ ہو سکا، اور نہ کسی خاتون ہی کو اتنی بڑی ذمہ داری سپرد ہوئی جتنی بڑی حضرت خدیجہؓ کے سپرد ہوئی اسی لئے حضور ﷺ حضرت خدیجہؓ کو ساری عمر یاد فرماتے رہے، آپ ﷺ نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت میں ایک بیش بہا موتیوں کے محل کی بشارت بھی دی اور حضرت جبرئیل نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت خدیجہؓ کو سلام بھی پہنچایا۔ ذرا تصور کیجئے اس اعزاز کا جو حضرت خدیجہؓ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی سلام پہنچنے پر حاصل ہوا، یہ سب کیوں ہوا، محض اس وجہ سے کہ حضرت خدیجہؓ حضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں یہ نہیں۔ بلکہ حضرت خدیجہؓ کے حضور ﷺ کے ساتھ اس قیمتی تعاون کی وجہ سے حاصل ہوا، جو انہوں نے اسلام کے نازک ترین دور میں اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ برحق کیساتھ کیا۔ اسی لئے حضرت خدیجہؓ کی وفات رسول اللہ ﷺ کے لئے نہیں بلکہ اسلامی دعوت کے لئے ایک بڑا سانحہ تھی، جس سے حضور ﷺ کو بہت تکلیف ہوئی۔

حضرت خدیجہؓ تو تاریخ اسلام کی خاتون اول ہیں لیکن حضور ﷺ کے ساتھ اس زمانے کی ساری ہی خواتین نے نہایت شیفتگی اور اسلام کے ساتھ نہایت تعلق اور دین کی مدد میں نہایت سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ام سلمہؓ کا نہایت دانش مندانہ مشورہ کس قدر مفید ثابت ہوا۔ وہ یہ کہ حضور ﷺ حج کی نیت سے سنہ ٦ھ میں اپنے اصحاب کی ایک کثیر تعداد میں مکے کیلئے نکلے حدیبیہ کے مقام پر جو مکہ سے تھوڑی ہی دور ہے کفار نے آپ کو آپ کے نیک ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد اتنی تھی کہ وہ کافروں سے ٹکر لے سکتے

تھے، اس لئے جب مسلمانوں نے دیکھا کہ باوجود اس کے کہ مسلمان نیک ارادے ہی سے آئے ہیں او صرف حج کرنا چاہتے ہیں لیکن کفار ان کو زبردستی روک رہے ہیں۔ تو ان کو بہت ناگوار ہوا رسول اللہ ﷺ نے مکہ والوں سے مصالحت کا ارادہ فرمالیا تھا۔ مسلمانوں کو مصلحت معلوم نہ تھی اس لئے ان کی غیرت و حمیت اور جوش کو زبردست دھکا پہنچا وہ بے تاب ہو گئے لیکن حضور ﷺ کی نافرمانی نہیں کر سکتے تھے البتہ ان کے ذہن اتنے متاثر ہوئے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ حضور ﷺ کے احکام کی بھی تعمیل کرنے سے معذور رہے، حتی کہ جب حضور ﷺ نے حکم فرمایا کہ قربانی کے جو جانور ساتھ لائے گئے ہیں وہ یہیں ذبح کردئے جائیں اور لوگ اپنے بال منڈوا کے احرام کھول دیں تو لوگ تعمیل کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ حضور ﷺ نے کئی بار فرمایا جب آپ نے لوگوں کو خاموش اور جامد پایا تو آپ حضرت ام سلمہؓ کے پاس اندر تشریف لے گئے اور اس بات کا افسوس کیساتھ ذکر فرمایا۔ اس وقت انہوں نے جو مشورہ دیا اس سے ایک طرف حضور ﷺ کے قلب مبارک میں اصحابؓ کی طرف سے جو شکایت تھی وہ رفع ہوگئی اور دوسری طرف آپ کے حکم کی تعمیل بھی ہوگئی انہوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ آپ تشریف لے جائیں اور کسی سے بات نہ کریں، آپ اپنے جانور کی قربانی کریں اور اپنے حجام کو بلا کر بال بنوالیں، آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا جس کو دیکھ کر سارے اصحابؓ کے ذہن اطاعت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور سب نے آپ کو دیکھ کر دیسا ہی کیا جیسا آپ نے کیا تھا اور اسطرح اس حکم کی تعمیل بحسن و خوبی ہو گئی جس کو تھوڑی دیر پہلے لوگ نہیں کر رہے تھے۔

زندگی کے ہر شعبے میں خواتین اسلام کی پختگی، دانش مندی اور بہادری کے صدہا ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ایک طرف عورتوں کا پایہ نہایت بلند معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف آنے والی نسلوں کے لئے وہ بہترین نمونہ نظر آتی ہیں۔

عہد اول میں بھی عورتوں کی خدمات بڑی قیمتی نظر آتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مطالعے سے یہ صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ اسلام کی تائید و نصرت میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے اور بعض موقعوں پر تو انہوں نے نہایت پیچیدہ صورتوں کو محض اپنی فہم و دور اندیشی یا جرأت و ہمت سے حل کیا۔

ازواج مطہرات باوجود اس کے کہ حضور ﷺ ان سے قریبی اور بے تکلفی کا تعلق رکھتے تھے، ایسا نہ تھا کہ آپ کے احترام میں کسی طرح کی کمی دکھائیں۔ اس سلسلے میں حضرت ام حبیبہؓ کا واقعہ بڑی اچھی مثال ہے، جب ان کے والد ابوسفیان فتح مکہ سے کچھ قبل ایک اہم ضرورت سے مدینہ منورہ آئے تو اپنی صاحب زادی ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کے پاس بھی گئے وہاں حضور ﷺ کا بستر موجود تھا اس پر جب وہ بیٹھنے لگے تو ام المومنین نے ان کو اٹھا دیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں نہیں سمجھا کہ تم نے اس بستر کو اس لئے اٹھا دیا ہے کہ مجھ سے فروتر سمجھا، یا اس لئے کہ مجھ کو اس بستر سے فروتر سمجھا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے اور آپ مشرک نجس آدمی ہیں، اس لئے مجھے پسند نہیں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر بیٹھیں۔

اسی سے ملتا جلتا احتیاط کا ایک واقعہ وہ بھی ہے جو ریحانہ بنت عمرو بن خنانہ کے متعلق منقول ہے کہ وہ غزوہ بنی قریظہ میں حضور ﷺ کی ملک میں آئی تھیں اور تا وصال آپ کی ملک میں رہیں حضور ﷺ نے ان کے سامنے اپنی زوجیت کے شرف میں لینے کی پیشکش رکھی۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول

ﷺ مجھے اپنی باندی ہی رکھیں اس سے میرا اور آپ کا دونوں کا بوجھ ہلکا رہے گا۔ اس طرح وہ اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے محتاط رہیں جس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے شاید اپنے کو کمزور سمجھ رہی تھیں۔

امہات المومنین کو حضور ﷺ سے محبت اور آپ سے تعلق انتہا درجے کا تھا ہر وہ بات جس سے حضور ﷺ کو مسرت ہوتی ہو اس کی کوشش اور جس سے آپ کو ملال ہوتا ہو اس سے احتیاط آخری حد تک رہا۔ واقعۂ افک میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں حضرت حسانؓ بھی تھے ان کے الفاظ اور گفتگوؤں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی دل آزاری ہوئی تھی اور وہ ان سے زخم خوردہ تھیں لیکن حدیث شریف میں مروی ہے کہ حضرت عائشہ اس کے باوجود اس بات کو ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حضرت حسانؓ کو برا کہا جائے اور فرماتی تھیں کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے حسب ذیل شعر کہا:

ان ابی و والدہ وعرضی
لعرض محمد منکم وقاء

(یعنی میرے باپ اور دادا اور خود میری آبرو محمد ﷺ کی آبرو کے لئے سپر دہیں)۔

حضور ﷺ سے محبت اور فدائیت میں اسلام کے دور اول کی خواتین کا حال یہ تھا کہ بنی دینار کی ایک خاتون کہ جن کے والد، بھائی اور شوہر تینوں غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ لیکن جب ان کو تینوں کی شہادت کی اطلاع پہنچائی گئی تو انہوں نے برملا کہا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے دکھاؤ میں دیکھوں گی۔ لوگوں نے اشارے سے آپ کو دکھایا۔ انہوں نے دیکھ کر کہا آپ ہیں تو ہر مصیبت ہلکی ہے اے رسول اللہ ﷺ۔

سوکنوں کی رقابت اور چشمک تو مشہور اور عام بات ہے بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ اس سے غالباً کوئی عورت بھی محفوظ نہیں رہتی ہوگی۔ ازواج مطہرات میں بھی اس سلسلے کے کچھ ہلکے ہلکے جذبات پائے جاتے تھے۔ حضرت عائشہ حضور ﷺ کی سب سے زیادہ محبوب زوجہ مطہرہ تھیں، ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کا مقابلہ زیادہ تر حضرت عائشہ سے چلا کرتا تھا۔ حضرت ام المومنین عائشہؓ نے اپنی حدیث افک میں اس کا ذکر فرمایا ہے لیکن ذکر اس ضمن میں فرمایا ہے کہ جب ان کے متعلق متعدد آدمیوں نے بے تحقیق باتیں کیں تو حضرت زینبؓ کے لئے بڑا موقع تھا کہ اس سے فائدہ اٹھاتیں لیکن انہوں نے اس اہم اور نازک موقع پر بھی ام المومنین حضرت عائشہؓ کے متعلق سوائے کلمہ خیر کے کچھ اور نہ کہا۔ حالانکہ دونوں میں چشمک چلا کرتی تھی، درحقیقت یہ وہ کسوٹی ہے جس پر بڑے بڑے متقی پورے نہیں اتر سکتے، لیکن امہات المومنین کا مقام ہی پر منحصر نہ تھیں بلکہ اس کے باہر بھی ہم کو ان کے کارنامے ملتے ہیں۔ بہادری، غم گساری اور بہت سی نیک خصوصیات میں یہ خواتین اپنی مثال آپ تھیں۔

غزوۂ بنی قریظہ میں حضرت رفیدہ زخمیوں کو مرہم پٹی اور تیمارداری کرتی تھیں، ان کا خیمہ مسجد نبوی ﷺ میں لگا ہوا تھا، جب کوئی صحابی گھائل ہوتے تھے تو حضور ﷺ فرماتے ان کو رفیدہ کے خیمے میں لے جاؤ۔

بہادری کا یہ حال تھا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر جب کہ سارے مسلمان خندقوں کے سامنے مجتمع تھے اور شہر کے محلے مسلمانوں سے خالی تھے عورتیں مردوں سے دور تھیں، شہر کے یہودیوں کی مکاری اور فریب کھل چکا تھا۔ ایسے موقع پر اس حویلی کے قریب جس میں مستورات مقیم تھیں، ایک یہودی بری نیت سے اتا ہوا نظر آیا۔ اس کو دیکھ کر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ایک صحابی سے جو اسی حویلی میں موجود تھے اور بعض کمزوریوں کے باعث میدان جنگ میں نہیں گئے تھے کہا کہ اس کو بڑھ کر ماریں انہوں نے معذرت کی تو بذات خود تشریف لے گئیں اور اور ایک ستون اٹھا کر اس کے سر پر مارا، جس کی تاب نہ لا کر وہیں ختم ہوگیا۔ اس طرح انہوں نے باوجود عورت ہونے کے دشمن مردوں پر رعب بٹھادیا۔

بہر حال یہ اور اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن سے تاریخ و سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں اگر آج کل کی خواتین ان واقعات کو اپنی زندگی کا نمونہ بنائیں تو وہ اسلام اور اپنے اسلامی معاشرے کی بیش بہا خدمت انجام دے سکتی ہیں جس کی بڑی ضرورت ہے۔

ماہ شوّال کے احکام

از: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

نمبر ۱: اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عید کی شب میں روزہ ہوتا ہے اور صبح کو کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو یہ بالکل بے اصل ہے۔ ہاں عید کی نماز کو کچھ کھا کر جانا سنت ہے۔

نمبر ۲: سویاں پکانی ضروری خیال کرتے ہیں یہ بھی غلط ہے بلکہ چاہے پکاوے اور چاہے نہ پکاوے شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

نمبر ۳: کپڑوں کا بہت لوگ اہتمام کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض لوگ قرض لے کر نئے کپڑے بنواتے ہیں مستعار کپڑے پہنتے ہیں اس کی بھی کوئی اصل نہیں بلکہ سنت یہ ہے کہ ہر شخص کے پاس جو کپڑے ہیں ان میں سے جو اچھے ہیں وہ پہنے۔

نمبر ۴: عید الفطر کے دن بارہ چیزیں مسنون ہیں۔ شرع کے موافق آرائش کرنا۔ غسل کرنا۔ مسواک کرنا۔ عمدہ کپڑے جو پاس موجود ہوں پہننا۔ خوشبو لگانا۔ صبح کو سویرے اٹھنا۔ عیدگاہ سویرے جانا۔ عیدگاہ جانے سے قبل کوئی شیریں چیز کھانا۔ عیدگاہ جانے سے قبل صدقہ فطر دے دینا۔ عید کی نماز بلا عذر شہر میں نہ پڑھنا۔ جس راستے سے آوے اس کے علاوہ دوسرے راستہ سے واپس آنا۔ پیادہ جانا اور راستہ میں اَللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرْ اَللّٰہُ اَکْبَرْ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ آہستہ پڑھتا جاوے۔

نمبر ۵: عید الفطر کی نماز پڑھنے کا یہ طریقہ ہے کہ اول یہ نیت کرے کہ "میں دو رکعت واجب عید الفطر مع چھ تکبیروں کے ادا کرتا ہوں۔" پھر یہ نیت کرکے ہاتھ باندھ لے اور سبحانک اللھم۔ الخ پڑھ کر تین مرتبہ اللہ اکبر کہے اور ہر مرتبہ کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور بعد تکبیر کے ہاتھ چھوڑ دے مگر بعد تیسری تکبیر کے ہاتھ باندھ لے اور امام قرأت شروع کرے اور مقتدی خاموش کھڑا رہے اور حسب دستور دو رکعت پڑھے دوسری رکعت میں بعد قرأت امام کے تین تکبیریں مثل سابق کے کہے لیکن یہاں تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ نہ باندھے بلکہ چھوڑ دے اور پھر تکبیر کہہ کر رکوع میں جاوے۔

نمبر ۶: خطبہ عیدین کا سنت ہے اور حاضرین پر اس کا سننا واجب ہے اس وقت بولنا چالنا یا نماز پڑھنا حرام ہے۔

نمبر ۷: یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ بعد نماز عید آپس میں معانقہ اور مصافحہ کرتے ہیں اور اس کو ضروری خیال کرتے ہیں یہ بالکل بدعت ہے ہاں جو لوگ باہر کے آئے ہیں اگر ان سے بوجہ ملاقات کے مثل اور ایام کے معانقہ یا مصافحہ کیا جاوے تو کچھ حرج نہیں ہے۔

نمبر ۸: عید کے روز باہم ایک دوسرے کو اس لفظ سے تہنیت دینا کہ تقبل اللہ منا ومنک یا اس کے ہم مضمون لفظ جیسے عید مبارک وغیرہ جائز اور فی الجملہ مستحب ہے بشرطیکہ بطور رسم کے پابندی کے ساتھ نہ ہو۔

نمبر ۹: اگر عید جمعہ کے روز واقع ہو تو دونوں کی نماز لازم ہے اول واجب دوسری فرض۔

نمبر ۱۰: بعض بے علم جمعہ کے روز عید واقع ہونے کو نامبارک سمجھتے ہیں یہ زعم بالکل باطل ہے بلکہ اس میں دو برکتیں جمع ہوجاویں گی۔

مزید احکام

نمبر ۱۔ صدقہ فطر۔ بعض لوگ صدقہ فطر مؤذنوں اور اماموں کو اس طرح دیتے ہیں کہ جب ان کو مسجد میں رکھتے ہیں تو منجملہ اور اشیاء کے ایک صدقہ فطر کو بھی ان کی اذان یا امامت کی اجرت میں شرط ٹھہرا لیتے ہیں کہ ہر سال صدقۂ فطر بھی ملا کرے گا تو اس طرح شرط کرکے ان لوگوں کو صدقہ فطر دینے سے ادا نہیں ہوتا اگر ایسا کیا گیا

ہے تو اس قدر دوبارہ فقراء پر صدقہ کرنا لازم ہے ہاں اگر بغیر کسی شرط کے صرف غریب سمجھ کر ان ہی کو دے دیا جاوے تو کچھ حرج نہیں ہے اور اگر کسی جگہ مشروط تو نہ ہو مگر معروف ہو تو اس وقت ان کو مسجد میں رکھتے وقت تصریحاً اس کی نفی کر دینا چاہئے کہ صدقۂ فطر نہ ملے گا۔

نمبر ۲: ماہ شوال میں چھ دن نفل روزہ رکھنے کی فضیلت اور دوسرے نفل روزوں سے بہت زیادہ ہے، جن کو کہ شش عید کے روزے کہتے ہیں لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کو عید کے اگلے ہی دن سے شروع کرے تب تو وہ ثواب ملتا ہے ورنہ نہیں ملتا۔ تو یہ خیال غلط ہے بلکہ اگر مہینہ بھر میں بھی ان کو پورا کر لیا تو ثواب ملے گا خواہ عید کے اگلے ہی دن شروع کرے یا بعد کو شروع کرے اور خواہ لگاتار رکھے یا متفرق طور پر رکھے ہر طرح ثواب ملے گا۔

نمبر ۳: بعض لوگ ان چھ روزوں میں اپنے پچھلے قضاء کے روزوں کو محسوب کر لیتے ہیں کہ شش عید کے روزے بھی ہو گئے اور قضاء بھی ادا ہو گئی۔ تو خوب سمجھ لیں کہ ان میں قضاء کی نیت کرنے سے وہ فضیلت شش عید کی حاصل نہ ہوگی۔ قضاء الگ ادا کرے اور ان کو ثواب کے لیے الگ رکھے۔ گو بعض کتابوں میں اس کو لکھ دیا ہے لیکن قواعد کے خلاف ہونے سے وہ صحیح نہیں خوب سمجھ لو۔

●●

ماضی سے اہم حال

واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق ماضی سے زیادہ حال سے ہے، ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا اور کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟ ملک اور ہم مسلمانوں کے لئے یہ موضوع زیادہ اہمیت رکھتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ آج کے اس منتخب اجلاس میں اور تعلیم یافتہ سامعین کے سامنے ہم کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس بدلتی ہوئی دنیا اور اس انقلابی دور میں جب کہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، اور ایک نیا سماجی ڈھانچہ بن رہا ہے، ہم بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت صاحب دعوت مسلمان کے اس ملک کی تشکیل جدید میں کیا حصہ لے سکتے ہیں؟ اور ہماری دعوت اور تعلیمات میں اس ملک کو دینے اور اس ملک کی رہنمائی کرنے، اس ملک کو استحکام عطا کرنے اور اسے ہر خطرے سے بچانے اور پوری دنیا میں باوقار بنانے کے لئے کیا صلاحیت پائی جاتی ہے؟ یہ میں قومی تعلّی کی بنا پر جو بڑی کمزوری رہی ہے اور احساس برتری کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ بالکل حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے اور ایک ایسی ملت کے فرد کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں جس کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ وہ سبزۂ خودرو کی طرح ہندوستان کے جنگل میں اُگ آئی ہو بلکہ وہ ایک اہم مقصد رکھتی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ جس ملک میں رہے اس کے حالات سے، اس کے حال و مستقبل سے بے تعلق نہ رہے، وہ خیالی دنیا میں زندگی نہ گزارے، وہ اپنے کو زندگی کے دھارے سے الگ نہ رکھے، اس کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ملک کی آبادی کے دوسرے عناصر اور فرقوں کی طرح ایک ہی کشتی میں سوار ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

چودھری اختر علی کالس، گجرات

عید الفطر

”عید“ کا لفظی مطلب مسرت و شادمانی ہے جب کہ فطر کا مطلب روزہ کھولنے یا روزہ رکھنے کے ہیں یعنی روزہ کھولنے کی خوشی کا دن۔

۲ ہجری سے قبل مسلمانوں کے پاس اجتماعی خوشی کے اظہار کے لئے کوئی تصور نہ تھا۔ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مدینے میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کے دو دن ایسے تھے جن میں وہ کھیلتے اور خوشی مناتے تھے۔ حضور ﷺ نے ان دنوں کی حقیت دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلیت میں اہل مدینہ ان دونوں میں اظہار مسرت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے ان سے بہتر دو دن عطا کئے ہیں اور وہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن ہیں۔ چنانچہ یکم شوال ۲ ہجری کو مسلمانوں نے پہلی عید الفطر منائی۔

ہجرت کا دوسرا سال اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ اسی سال رمضان کے روزے فرض کئے گئے۔ اسی سال اسی ماہ میں غزوۂ بدر لڑی گئی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مبین عطا فرمائی۔ اسی ماہ میں مکہ فتح ہوا۔ اسی ماہ میں قرآن مجید کا نزول ہوا اور اسی ماہ میں مسلمانوں کو لیلۃ القدر جیسی مقدس رات نصیب ہوئی۔ رمضان المبارک ۲ ہجری میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہت سی رحمتوں اور مسرتوں سے نوازا، جن کا اظہار انہوں نے یکم شوال ۲ ہجری کو عید الفطر کی صورت میں پہلی دفعہ کیا۔

عید الفطر کی فضیلت

حدیث میں آتا ہے کہ جب عید الفطر کی رات ہوتی ہے تو اس کا نام آسمانوں پر لیلۃ الجائزۃ (انعام کی رات) سے لیا جاتا ہے اور جب عید کی صبح ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو تمام شہروں میں بھیجتے ہیں۔ وہ زمین پر اتر کر تمام گلیوں، راستوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی آواز سے جس کو جنات اور انسان کے سوا تمام مخلوق سنتی ہے، پکارتے ہیں کہ اے محمد ﷺ کی امت! اس رب کریم کی درگاہ کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے اور بڑے بڑے قصور معاف کرنے والا ہے۔

پھر لوگ جب عیدگاہ کی طرف نکلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہے۔

وہ عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے معبود اور ہمارے مالک! اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی مزدوری پوری پوری دے دی جائے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، اے فرشتو! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں۔ میں نے انہیں رمضان کے روزوں اور تراویح کے بدلے میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی اور بندوں سے خطاب فرما کر ارشاد فرماتا ہے:

”اے میرے بندو! مجھ سے مانگو۔ میری عزت کی قسم، میرے جلال کی قسم! آج کے دن اپنے اس اجتماع میں مجھ سے اپنی آخرت کے بارے میں جو سوال کرو گے، عطا کروں گا۔ اور دنیا کے بارے میں جو سوال کرو گے، اس میں تمہاری مصلحت پر نظر کروں گا۔ میری عزت کی قسم کہ جب تک تم میرا خیال رکھو گے، میں تمہاری لغزشوں پر ستاری کرتا رہوں گا اور ان کو چھپاتا رہوں گا۔ میری عزت کی قسم اور میرے جلال کی قسم! میں تمہیں مجرموں اور کافروں کے سامنے رسوا اور فضیحت نہ کروں

گا۔ بس اب بخشے بخشائے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ تم نے مجھے راضی کر دیا اور میں تم سے راضی ہو گیا۔" پس فرشتے اس اجر وثواب کو دیکھ کر جو اس امت کو افطار کے دن ملتا ہے، خوشیاں مناتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔

عید الفطر عالم اسلام کا ایک ایسا مذہبی تہوار ہے جس میں اسلامی برادری کا ہر فرد خواہ وہ کسی بھی مکتبہ فکر یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو، اجتماعی زندگی کے اس عظیم الشان اور ایمان افروز مظاہرے میں حسب توفیق شامل ہوتا ہے۔ یہ مقدس تہوار ثابت کرتا ہے کہ مسلمان مذہبی طور پر ایک ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اگرچہ دنیا کی ہر قوم اپنے تہوار بڑی عقیدت اور دھوم دھام سے منانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جو روحانی مسرت مسلمانوں کو عید میں حاصل ہوتی ہے اس کی مثال دنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ وہ جب نماز عید کے اجتماع میں کمال عجز سے اپنی پیشانی سجدے میں رکھ کر اپنے خدا کی شان وعظمت کا اقرار کرتا ہے تو رب العالمین اسے اپنا بندہ بنا لیتا ہے اور اس سے راضی ہو جاتا ہے۔

عید کے دن آنحضرتؐ کے معمولات

عید الفطر کے دن آنحضرت ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ صبح اٹھ کر غسل فرماتے۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد خوشبو لگاتے۔ پھر کوئی میٹھی چیز کھاتے اور اس کے بعد نماز عید کے لئے عیدگاہ تشریف لے جاتے۔

راستے میں قدرے بلند آواز سے عید کی تسبیح کا ورد کرتے جاتے۔ نماز سے پہلے نہ اذان دی جاتی اور نہ اقامت کہی جاتی۔ نماز کے بعد حضور ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہو جاتے اور اپنے عصا مبارک کے سہارے کھڑے رہتے۔ لوگ صفیں باندھے آپ ﷺ کے سامنے بیٹھے رہتے۔ خطبے میں آپ ﷺ لوگوں کو ضروری ہدایات اور نصیحتیں فرماتے۔ اس کے بعد دعا کی جاتی اور پھر لوگوں سے ملاقات فرماتے۔ آپ ﷺ جس راستے سے عیدگاہ تشریف لاتے، واپسی پر اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتے۔

حضرت خالد بن سعیدؓ سے روایت ہے کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ مومن کے اس نیک کام میں زیادہ سے زیادہ لوگ گواہ رہیں۔

آپ ﷺ عید سے پہلے فطرہ ادا فرماتے، خصوصاً یتیموں کے گھر جاتے اور ان کو پیار کرتے اور نماز عید کے بعد مریضوں کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے۔ اس طرح آپ یتیموں، ناداروں اور مریضوں کو اپنی خوشی میں شریک فرماتے۔ عید منانے کا اصل طریقہ اور اسلامی تصور یہی ہے۔

●●

آئندہ نسل کے دین وعقائد کی حفاظت اولین ذمہ داری

اس وقت ہر گھر کے ذمہ داروں، بچوں کے والدین اور موجودہ نسل کے لوگوں کو اپنے بچوں اور اپنی آئندہ نسل کو دین کی ضروریات سے اسلامی عقائد دینی فرائض اور اسلامی اخلاق سے واقف کرانے اور بنیادی تعلیم دینے کی ذمہ داری خود قبول کرنا ہے اور ان پر لازم ہے کہ اس کو اپنا ایسا ہی انسانی واسلامی فرض سمجھیں جیسا بچوں کی خوراک وغذا ولباس وپوشاک، صحت اور بیماری کے علاج کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور اس کا انتظام کرتے ہیں، بلکہ حقیقت میں دین کی ضرورت، عقائد کی تعلیم اور صحیح اسلامی عقیدہ کی حفاظت اور تقویت کا کام ان جسمانی وطبعی ضروریات کی تکمیل اوان کے انتظام سے بھی زیادہ ضروری ہے، اور اس سے غفلت ان انسانی وجسمانی ضروریات کی تکمیل سے غفلت برتنے اور اس کے بارے میں سہل انگاری سے کام لینے سے زیادہ خطرناک اور برے دائمی نتائج کا سبب ہے۔

حافظ ارشاد احمد دیوبندی، ظاہر پیر

سیدنا حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ

عمرو بن الجموحؓ زمانہ جاہلیت میں یثرب (مدینہ منورہ) کے زعما میں سے ایک زعیم، بنی سلمہ کے سردار، یثرب کے اغنیاء میں سے ایک سخی اور اس کے اصحاب ثروت میں سے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں اشراف کا یہ معمول تھا کہ ان میں سے ہر شخص اپنے لئے گھر میں ایک صنم رکھتا تا کہ اس صنم سے صبح وشام تبرک حاصل کرے تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کے موقع پر اس کے لئے جانور ذبح کرے اور مصائب میں اس کی پناہ میں رہنے کو اور خاندان کو (بزعم خویش) محفوظ رکھے۔ عمرو بن الجموح کا صنم "مناۃ" کے نام سے پکارا جاتا تھا جسے انہوں نے خود عمدہ لکڑی سے بنایا تھا اس صنم کی دیکھ بھال اس کے رکھ رکھاؤ اور اس پر عمدہ خوشبوئیں ملنے میں وہ بہت ہی مبالغہ آمیزی کرتے تھے، جب دین اسلام کی نورانی شعائیں مدینہ طیبہ کو مبلغ اول حضرت مصعب بن عمیرؓ کی سعی بلیغ سے یکے بعد دیگرے ہر گھر کو منور کرنے لگیں تو اس وقت حضرت عمرو بن الجموح کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو رہی تھی، ان کے تین بیٹے تھے معوذ، معاذ، اور خلاد۔ اور ان کے ہم جولی سیدنا حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر اسلام لانے کی سعادت حاصل کر چکے تھے، بلکہ انکے تینوں بیٹوں کے ساتھ ان کی والدہ محترمہ بھی اسلام کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہوئیں لیکن عمرو کو ان کے متعلق تا حال کچھ علم نہیں تھا۔ عمرو بن الجموح کی بیوی ہند نے دیکھا کہ اہل یثرب پر الحمدللہ اسلام غالب آتا جا رہا ہے گنتی کے چند افراد کے سوا جن میں ان کے خاوند بھی شامل ہیں بڑے بڑے اشراف میں سے اور کوئی بھی شرکیہ دین پر نہیں رہا ممدوحہ اپنے شوہر کو بہت چاہتیں ان کی تعظیم کرتیں اور ان کے حالت کفر وشرک میں مرکر دوزخ کا ایندھن بننے سے بہت ڈرتیں بلکہ بعض اوقات اس تصور سے رونے بیٹھ جاتیں اور وہ تھے کہ ان کو ہر وقت یہی خوف کھائے جاتا کہ کہیں ان کے بیٹے اپنے دین کو خیرباد کہہ کر دین اسلام کے سرگرم داعی حضرت مصعب بن عمیرؓ کی پیروی کرنے نہ لگ جائیں جو ایک قلیل عرصے میں بہت سے لوگوں کو ان کے مشرکانہ دین سے منحرف کر کے دین اسلام میں داخل کر چکے ہیں، انہوں نے اپنی بیوی سے کہا "اے ہند" دیکھ کہیں تیرے بیٹے اس آدمی (یعنی حضرت مصعب بن عمیرؓ) سے ملنے نہ پائیں تا وقتیکہ ہم ان کے متعلق اپنی کوئی رائے قائم نہ کر لیں۔ وہ بولیں آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن آپ "معاذ" سے بھی دریافت فرمائیں کہ وہ اس آدمی کے متعلق کیا کہتا ہے؟ وہ بڑے غصے میں بولے اری تیرا بیڑا غرق ہو معاذ میری لاعلمی میں اپنے آباء واجداد کے دین سے منحرف ہو گیا ہے۔

تو اس نیک بخت خاتونؓ نے اپنے میاں پر رحم کھاتے ہوئے کہا ہرگز نہیں اس نے تو فقط اس سرگرم آدمی اور سرگرم داعی کی بعض مجالس میں حاضری دی ہے اور جو وہ داعی کہتا ہے اس میں سے کچھ اس نے یاد بھی کر لیا ہے، کہا اس کو میرے پاس بلاؤ جب وہ عمرو بن الجموح کے پاس آئے تو کہا یہ آدمی (سیدنا حضرت مصعب بن عمیرؓ) جو کچھ کہتا ہے اس میں سے مجھے بھی کچھ سناؤ تو معاذ نے کہا "بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالک یوم الدین، ایاک نعبد وایاک نستعین، اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین

انعمت علیهم، غیر المغضوب علیهم ولا الضالین ۔" یہ مقدس کلام مبارک سن کر بولے یہ کلام کیا ہی خوب ہے کتنا ہی بہتر ہے اور کس قدر جمیل ہے کیا ان کا سارا کلام ایسا ہی ہے؟ حضرت سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ بہت ہی خوب بہت ہی عمدہ اور بہت ہی بہتر ہے پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کیا آپ ان کی بیعت کرلیں گے آپ کی پوری قوم ان کی بیعت کر چکی ہے؟ شیخ تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر کہا میں "مناۃ" کے مشورے کے بغیر ایسا کوئی فعل کرنے کے لئے فوری تیار نہیں ہو سکتا میں دیکھتا ہوں وہ کیا کہتا ہے؟ یہ سن کر نوجوان نے کہا کہ بھلا "مناۃ" کیا کہے گا وہ تو ایک ٹھوس لکڑی ہے جو کوئی سوجھ بوجھ بھی قطعاً نہیں رکھتی نہ وہ کوئی حاجت روا ہے نہ وہ کارساز ہے نہ وہ مشکل کشا ہے نہ اس میں کوئی عقل ہے نہ فہم نہ چلنے کی طاقت نہ بولنے کی ابھی وہ کچھ اور بھی اس کے بارے میں کہنے والے تھے کہ شیخ نے چیخ کر اور جھلا کر کہا میں نے تجھے کہہ دیا ہے کہ اس کے بغیر (یعنی مناۃ) کے بغیر میں خود بخود کوئی فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتا پھر وہ یعنی عمرو بن الجموح "مناۃ" کے پاس گئے یہ لوگ جب بھی اس صنم سے کوئی بات کرنا چاہتے اس صنم کے پیچھے ایک بہت بوڑھی عورت کو کھڑا کر دیا کرتے ان کے خیال میں وہ جو کچھ (وہ صنم) ان کے دل میں ڈالتا وہ اس کی جانب سے جواب سمجھا جاتا تھا پھر وہ اپنے دراز قد کے ساتھ کھڑے ہوئے اپنی واحد ٹانگ سے جو کہ صرف ایک ہی تھی ٹیک لگائی ان کی دوسری ٹانگ سخت قسم کی لنگڑی تھی اور اس صنم کی خود بخود تعریف کرتے ہوئے کہا "اے مناۃ" یقیناً تجھے معلوم ہو ہی چکا ہے کہ یہ سرگرم مبلغ ہمارے پاس مکہ مکرمہ سے آیا ہے اور تیرے سوا اور کسی سے بھی برائی سے پیش آنا نہیں چاہتا وہ آیا ہی فقط اس لئے ہے کہ ہمیں تیری عبادت تیری بندگی سے ہٹا دے علیحدہ کر دے میں نے تیرے مشورے کے بغیر اس کی بیعت کرنا پسند نہیں کی باوجودیکہ میں اس کی طرف سے بہت ہی عمدہ کلام سن چکا ہوں اب میں تجھ سے مشورہ کر رہا ہوں مجھے کوئی اچھا مشورہ دیجئے لیکن "مناۃ" نے (جو کہ حقیقت میں ایک بے جان لکڑی تھی) کوئی جواب نہ دیا تو تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد خود ہی بولے شاید تو مجھ سے خفا ہے اور ناراض ہو گیا ہے میں نے تجھ سے ایسی ویسی کوئی بات تو کی نہیں جو بعد میں تیری اذیت کا موجب بنتی خیر کوئی بات نہیں جب تک تیرا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا میں تجھ سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کروں گا۔

عمرو بن الجموح کے بیٹوں کو اپنے والد کے صنم کے ساتھ دیرینہ تعلق کا بخوبی علم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے والد کس طرح ایک عرصہ دراز سے ان کا ایک جزو بنا رہا ہے لیکن وہ سمجھ گئے کہ اب ان کے دل میں اس صنم "بت" کی قدر و منزلت متزلزل ہو چکی ہے الحمد للہ علی ذالک اب ان کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ان کے لئے اس کے دل سے اس قدیمی صنم کی ہجو ذلت بٹھا کر اپنے والد کو اس صنم سے پوری طرح بدظن کر دیں کیوں کہ ان کے والد کے ایمان لانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ عمرو بن الجموح کے بیٹے اپنے دوست حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ رات کو "مناۃ" کے پاس گئے اور اس کو اس کی جگہ سے اٹھایا اور بنی سلمہ کے گڑھے کی طرف لے گئے جہاں اہل محلہ پیشاب اور پاخانہ ڈالتے تھے وہاں اس صنم کو پھینک کر اپنے گھروں کو اس طرح لوٹے کہ کسی کو بھی اس واقعہ کا علم نہ ہوا، جب صبح ہوئی عمرو حسب عادت اپنے صنم کے پاس اس کو سلام کرنے کے لئے گیا تو اس کو وہاں موجود نہ پایا تو کہنے لگا تم پر اے صنم اللہ تعالیٰ کی مار ہو تو کہاں ناراض ہو کر غائب ہو گیا ہے مگر اس کو کہیں سے صنم سے متعلق جب کوئی معلومات نہ ہوئی تو اس کو تلاش کرتے کرتے اسے ایک گڑھے میں سر کے بل اوندھا پایا پھر آپ نے اسے نہلایا دھلایا

پاک کیا اور اس صنم پر نہایت عمدہ خوشبو لگائی پھر اس کو اسی جگہ پر رکھ دیا پھر اسے مخاطب کر کے کہا واللہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیرے ساتھ ایسی گندی حرکت کس نے کی ہے تو میں اسے ابھی ابھی ہر حال میں ذلیل وخوار کر دیتا۔ پھر جب دوسری رات ہوئی تو ان نوجوانوں نے "مناۃ" پر حملہ بول دیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو گزشتہ رات کیا تھا پھر جب صبح ہوئی تو شیخ نے دیکھا صنم ندارد، بڑا افسوس ہوا اور اس کو ڈھونڈنے نکلے تو پھر اس کو ایک گڑھے میں لتھڑا ہوا پایا آپ نے اسے پھر اٹھایا اس کو نہلایا اور عمدہ خوشبو لگا کر اس کی جگہ اسے رکھ دیا مگر یہ نوجوان بھی اس صنم کے ساتھ ہر روز ایسا ہی کرنے لگے پھر جب شیخ ان سے عاجز آگئے تو سونے سے پہلے ایک بار اس کے پاس گئے اور اپنی تلوار لے کر اس کے گلے میں لٹکا دی اور اس سے کہا "اے مناۃ"! آپ جس کو اپنے ساتھ ایسی بدسلوکی کرتے دیکھ رہے ہیں واللہ میں اس کو نہیں جانتا اگر آپ کو کوئی خبر ہے تو اس شر کو آپ خود ہی دور کر لیجئے اور یہ تلوار اس مقصد کے لئے میں آپ کے گلے میں ڈال کر جا رہا ہوں یہ کہہ کر وہ پھر اپنے بستر پر دراز ہو گئے جوں ہی نوجوانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ شیخ گہری نیند سو چکے ہیں وہ صنم کی طرف گئے اس کی گردن سے تلوار اتاری اور گھر سے باہر ایک رسی سے اسے ایک مردہ کتے کے ساتھ باندھا اور دونوں کو (کتے اور صنم کو) بنی سلمہ کے کنویں میں ڈال دیا جس کی طرف گندگی بہہ کر اکٹھی ہوتی رہتی تھی، پھر جب شیخ نیند سے بیدار ہوئے اور صنم کو وہاں موجود نہ پایا تو حسب عادت اس کو ڈھونڈنے کے لئے باہر نکلے تو اس صنم کو مردہ کتے کے ساتھ بندھا ہوا اور اوندھے منہ پڑا پایا، ملاحظہ کیا کہ تلوار بھی اس سے چھینی جا چکی ہے تو اب کی بار شیخ نے اس صنم کو گڑھے سے نہیں نکالا، جہاں انہیں انہوں نے پھینکا تھا اسے وہیں پڑا رہنے دیا اور اسے کہا، واللہ اگر تو معبود ہوتا تو تو اور کتا اس کنویں کے وسط میں اکٹھے بندھے ہوئے نہ پڑے ہوتے پھر اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کے لئے انشراح صدر فرما دیا تو کہا اب دین اسلام میں یا اللہ مجھے قبول فرما لیجئے اور دل میں پختہ عہد کیا کہ اب دین اسلام میں داخل ہونے کے لئے دیر نادانی کے مترادف ہے۔ تو عمرو بن الجموح نے حلاوت ایمان کا کچھ ایسا مزہ چکھا کہ جو زندگی کے ایام گزر چکے تھے ان پر کف افسوس ملنے لگے جو انہوں نے حالت شرک میں بسر کئے تھے پھر اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا جان و مال اور اولاد سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کی ٹھان لی حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے بھی دور سے ملاحظہ فرمایا کہ عمرو بن الجموح لنگڑاتے ہوئے شرف تولیت اسلام کے لئے گویا دوڑتے ہوئے آرہے ہیں حاضری دی اور بڑی بھرائی ہوئی آواز میں کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس کے بعد سیدنا حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ نے خیر کم فی الجاهلية خیر کم فی الاسلام کی عظیم الشان یاد تازہ کر دی۔ اپنے عقیدۂ اسلام کی سرفرازی پر اپنے خوش اور مسرور رہتے کہ گھر میں اور گھر سے باہر حلقۂ احباب میں غیر اللہ اور من دون اللہ کی الوہیت کے رد میں خوب بحث مباحثہ فرماتے اور دل میں یہ تمنا ہوتی کہ خدا کرے اب کوئی غزوہ پیش آئے تا کہ میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت عظمیٰ کی سعادت حاصل کر سکوں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے بعد غزوۂ احد کا واقعہ پیش آ گیا تو سیدنا حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ نے اپنی خوشی کا اظہار فرمایا اور اپنے تینوں بیٹوں کو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ مقابلے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے چونکہ خود کافی حد تک معذور تھے صرف ایک ٹانگ تھی اس لئے اس تیاری میں حصہ نہ لے سکتے مگر قلبی تعلق سے حضرت نبی کریم ﷺ کے جھنڈے تلے جہاد کے واسطے جانے کے لئے کراہت کس

لی لیکن سب نوجوانوں نے مل کر اپنے والد کو ان کے اس عزم جہاد سے منع کیا۔ آپؓ ایک تو عمر رسیدہ بزرگ تھے اور ساتھ ہی بڑی مجبوری یہ کہ آپؓ سخت لنگڑے بھی تھے اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں دیگر معذور لوگوں کی طرح معذور قرار دے کر جہاد کی شرکت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اس لئے انہوں نے بھی اپنے والد ماجد بزرگوار سے اصرار کرتے ہوئے کہا ”اے ابا جان اللہ عزوجل نے تو آپ کو معذور قرار دیا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرکت جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے تو آپ اپنے کو کیوں مشقت میں ڈال رہے ہو جس سے باری تعالیٰ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔“

اپنے بیٹوں کی یہ باتیں سن کر حضرت شیخ آگ بگولا ہوگئے اور فوراً حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں اپنے تینوں بیٹوں کی شکایت کرتے ہوئے فرمایا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے یہ بیٹے مجھے اس کار خیر سے روکنا چاہتے ہیں اور یہ میرے بیٹے دلیل دیتے ہیں کہ ”میں لنگڑا ہوں“ اے اللہ کے سچے نبی! واللہ میں تو یہ امید رکھتا ہوں کہ میں شہادت کی عظمت حاصل کرکے جنت الفردوس میں اپنی ایک ہی ٹانگ سے لنگڑا کر چلوں یہ سن کر حضرت نبی کریم ﷺ نے ان کے بیٹوں سے فرمایا آپ اپنے والد کو جہاد فی سبیل اللہ نہ روکئے اس طرح ان کی دل آزاری ہوتی ہے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شہادت کی عظیم سعادت سے سرفراز فرمادیں تو آپ کے بیٹوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا حکم مان کر اپنے والد ماجد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر جوں ہی جہاد کے لئے جانے کا وقت آیا حضرت شیخ عمرو بن الجموح نے اپنی بیوی کو ایسے بچھڑنے والے کی طرح خیرباد کہا جو پھر کبھی واپس نہ آئے پھر قبلہ رو ہوکر دونوں ہاتھ حضرت شیخ نے آسمان کی طرف بلند کئے اور کہا، اے اللہ رب قدوس مجھے اپنی خاص الخاص رحمت کے طفیل شہادت کی سعادت نصیب فرما اور مجھے واپس گھر نہ لوٹا پھر وہ اپنے تینوں بیٹوں اور اپنی قوم بنی سلمہ کی ایک بڑی جماعت کے گھیرے میں بہت ہی مسرور ہوکر کفار و مشرکین کے ساتھ لنگڑے ہونے کے باوجود جہاد کی غرض سے روانہ ہوگئے (لنگڑاتے ہوئے) جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور لوگ حضرت امام الانبیاء علیہ الصلاۃ والسلام سے الگ ہوئے تو سیدنا حضرت عمرو بن الجموح کو ہراول دستے میں جاتے ہوئے دیکھا گیا وہ اپنی واحد صحیح ایک ٹانگ کے بل پر خوب بڑی بڑی چھلانگیں لگاتے ہوئے فرماتے جاتے تھے ”میں جنت الفردوس کا مشتاق ہوں اللہ تعالیٰ کی توحید کی اشاعت کے لئے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے آیا ہوں اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے چھوٹے بیٹے خلادؓ تھے حضرت شیخ اور ان کا نوجوان بیٹا دونوں ہی حضرت نبی کریم ﷺ کی طرف سے داد شجاعت حاصل کرتے رہے حتی کہ سرزمین معرکہ میں دونوں ہی فی سبیل اللہ شہید ہوکر گرے۔ بیٹے اور باپ کے درمیان صرف چند لمحوں کا فرق تھا، جوں ہی معرکہ ختم ہوا حضرت نبی کریم ﷺ احد کے شہداء کو قبروں میں دفن کرنے کے لئے اٹھے اور آپ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا ان کو (عمرو بن الجموحؓ) ان کے خون اور زخموں کے ساتھ رہنے دو میں ان کا گواہ ہوں پھر آبدیدہ ہوکر فرمایا جو مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں زخم کھاتا ہے قیامت کے دن وہ بہتے ہوئے خون کے ساتھ آئے گا جس کا رنگ زعفران جیسا ہوگا اور خوشبو کستوری کی خوشبو جیسی ہوگی پھر فرمایا عمرو بن الجموحؓ کو عبداللہ بن عمرو کے ساتھ دفن کرو کہ دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے اور ایک دوسرے کے ساتھ صلح و صفائی سے رہتے تھے اللہ تعالیٰ عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ اور احد میں ان کے شہید ساتھیوں سے خوش ہوں۔ آمین۔

قارئین رضوان سے گذارش

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، تاکہ دفتری کارروائی میں آسانی ہو۔

ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

"Rizwan Monthly"

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

محترم مولانا احمد عثمان محمود

امام بخاری رحمہ اللہ کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ اور نام و نسب یہ ہے، ”محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرہ بن بردزبہ (اس لفظ کو باء موحدہ کے فتح اور رائے مہملہ کے سکون اور دال مہملہ کے کسرہ اور اور زاء معجمہ کے سکون اور اس کے بعد کی باء موحدہ کو فتح اور تاء تانیث موقوفہ سے پڑھنا چاہئے۔ بردزبہ، دہقان، بخارا کی لغت میں کاشت کار یا کارندہ کو کہتے ہیں، امام بخاریؒ کو ”ولاء“ کی طرف نسبت کرکے ”جعفی“ کہتے ہیں۔ چوں کہ اس زمانے کا یہ دستور تھا، کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا تھا، اس کو اسی کے قبیلے کی طرف منسوب کرتے تھے۔ امام بخاریؒ کے جدِ ثانی...... مغیرہ، حاکم بخارا ”یمان“ (امام بخاری) جعفی کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے اس وجہ سے امام بخاریؒ کو بھی ”جعفی“ کہنے لگے۔

امام بخاری ۱۳ شوال سنہ ۱۹۴ھ کو جمعہ کے دن بعد نمازِ جمعہ پیدا ہوئے۔ آپ کمزور جسم کے تھے۔ نہ دراز قد، نہ کوتاہ قد، بلکہ درمیانہ قد رکھتے تھے۔ امام بخاریؒ بچپن میں ہی نابینا ہوگئے تھے، اس وجہ سے ان کی والدہ کو اس کا سخت قلق رہتا تھا۔ اور وہ نہایت گریہ وزاری سے خدا تعالیٰ کی جناب میں ان کی بصارت کے لئے دعا کیا کرتی تھیں۔ ایک شب کو ان کی والدہ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کو خواب میں دیکھا، آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تیری گریہ و زاری اور دعا کے سبب تیرے فرزند کو بصارت عنایت فرمائی۔ جب وہ صبح کو اٹھیں تو اپنے لخت جگر کی آنکھوں کو روشن و بینا پایا۔

امام بخاری کو احادیث یاد کرنے کا شغف و شوق بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ دس سال کی عمر میں یہ حالت تھی کہ مکتب میں جس جگہ ”حدیث“ سنتے فوراً اس کو یاد کرلیتے۔

مکتب سے فراغت پائی اور یہ معلوم ہوا کہ بخارا میں ”داخلی“ علمائے حدیث میں سے ہیں تو ان کی خدمت میں آمد و رفت شروع کی۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ داخلیؒ اپنے نسخے میں سے لوگوں کو احادیث سنا رہے تھے۔ درس کے دوران ان کی زبان سے نکلا ”سفیانؒ عن ابی الزبیرؒ عن ابراھیمؒ“ امام بخاریؒ فوراً بول پڑے کہ حضرت ابوالزبیرؒ تو ”ابراہیمؒ“ سے روایت نہیں کرتے، مگر جب ”داخلی“ نے ان کی بات کو تسلیم نہ کیا تو امام بخاریؒ نے کہا کہ اس کو اصلی نسخے میں تو دیکھنا چاہئے۔ ”داخلی“ اپنے مکان میں تشریف لے گئے اور اصل نسخے پر نظر ڈالی باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ اس لڑکے کو بلاؤ۔ جب امام بخاریؒ حاضر ہوئے تو داخلیؒ نے فرمایا: ”کہ میں نے اس وقت جو پڑھا تھا بے شک وہ غلط نکلا، اب آپ بتائیں کہ صحیح کس طرح ہے۔ اس پر امام بخاریؒ نے عرض کیا کہ صحیح سفیان عن الزبیر عن عدی عن ابراہیم ہے داخلیؒ حیران ہوگئے اور کہا کہ واقعی ایسا ہی ہے، پھر قلم اٹھا کر ”قراءۃ“ کے نسخے کی تصحیح کی۔ یہ واقعہ ان کی عمر کے گیارہویں سال کا ہے۔ جب امام بخاریؒ سولہ سال کے ہوئے تو آپ نے عبداللہ ابن المبارکؒ کی تمام کتابیں یاد کرلیں، اور وکیعؒ کے نسخے بھی ازبر کرلئے۔ پھر اپنی والدہ اور بھائی احمد کے ہمراہ برائے حج، مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حج سے فراغت پائی تو ان کی والدہ اور بھائی وطن واپس چلے آئے اور وہ خود بلادِ حجاز میں، طلب حدیث کے لئے رک گئے۔ جب اٹھارہ سال کے ہوئے تو سلسلۂ تصنیف شروع کیا اور فضائل صحابہؓ و تابعینؒ اور ان کے اقوال کا ذخیرہ فراہم کرنے لگے،

یہاں تک کہ اس کو ایک مجموعہ کی شکل دے کر اور مرتب کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر "کتاب التاریخ" کا مسودہ شروع کردیا۔ آپ راتوں کو چاند کی روشنی میں لکھا کرتے تھے۔ امام بخاریؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اس تاریخ میں کوئی ایسا نام نہیں ہے جس کے بارے میں ایک طویل قصہ مجھے یاد نہ ہو۔ اگر کتاب کی طوالت اور شاگردوں کے ملال اور اکتا جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان تمام قصوں کو اس تاریخ میں لکھ دیتا۔ حاشدؒ بن اسماعیل (جو امام بخاریؒ کے زمانہ کے محدث ہیں) کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ طلب حدیث کے لئے میرے ہمراہ، شیوخ وقت کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے، لیکن ان کے پاس قلم، دوات، یعنی لکھنے کا سامان کچھ نہ ہوتا تھا اور نہ وہاں کچھ لکھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تم حدیث کو سن کر لکھتے نہیں تو تمہارے آنے جانے سے کیا فائدہ؟ اس طرح کا سننا تو ہوا کی طرح ہے کہ ایک کان سے گھس کر دوسرے کان سے نکل جاتی ہے۔ سولہ دن کے بعد امام بخاریؒ نے مجھ سے کہا کہ تم لوگوں نے مجھے بہت تنگ کردیا، آؤ اب میری یاد کا اپنے نوشتوں سے مقابلہ کرو۔ اس مدت میں ہم نے پندرہ ہزار حدیثیں لکھی تھیں۔ امام بخاری نے از بر صحت کے ساتھ سب کو اس طرح سنایا کہ میں خود اپنی لکھی ہوئی کو ان سے صحیح کرتا تھا اس کے بعد امام بخاریؒ نے کہا کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں عبث اور بے فائدہ سرگردانی کرتا ہوں۔ حاشدؒ بن اسماعیل کہتے ہیں کہ میں اسی روز سمجھ گیا کہ یہ ہونہار ہیں اور (آگے چل کر) کوئی ان سے مقابلہ نہ کرسکے گا۔

جامع (صحیح امام بخاری) کی تصنیف

کا سبب یہ ہوا کہ وہ ایک دن اسحاق بن راہویہؒ کی مجلس میں حاضر تھے۔ اسحاق بن راہویہؒ کے احباب نے کہا کہ اچھا ہوا گر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی توفیق دے کہ سنن میں کوئی ایسا مختصر مجموعہ تیار کرے، جس میں صرف وہ صحیح حدیثیں ہوں جو صحت میں اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہوں تاکہ عمل کرنے والے بلا خوف و تردد مجتہدین کی طرف مراجعت کئے بغیر اس پر عمل پیرا ہو، امام بخاریؒ کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی اور اسی وقت سے اس "جامع" کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ چھ لاکھ حدیثوں کے اس ذخیرے میں سے جو ان کے پاس موجود تھا، انتخاب شروع کیا، جو ان میں صحیح ترین تھیں ان پر اکتفا کیا اور بعض وہ احادیث جو اسی درجے پر صحیح تھیں، ان کو طوالت کے خوف یا کسی دوسرے سبب سے چھوڑ بھی گئے، امام بخاریؒ جب کسی حدیث کو لکھنے کا ارادہ کرتے تھے تو اول غسل کرکے دو رکعت نفل ادا کرتے اور پھر اس کو لکھتے، چنانچہ سولہ سال کے عرصے میں اس انتخاب سے فراغت پائی۔ جب اس کا قصد کیا کہ ان حدیثوں کی ان کے مضمون کے مطابق ترتیب دی جائے (اس کو اصلاح محدثین میں "ترجمۃ الباب" کہتے ہیں) تو مدینہ منورہ میں قبر مبارک اور منبر رسول اللہ ﷺ کے درمیانی مقام میں اس اہم کام کو انجام دیا، ہر "ترجمے" پر دو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔ الغرض امام بخاریؒ کی حسنِ نیت کا نتیجہ تھا کہ یہ "جامع" اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی زندگی میں ہی اس کو نوے ہزار آدمیوں نے آپ سے بلاواسطہ سنا، جس میں سب سے آخری "فربری" ہیں اور آج کل ان کی روایت ہی علو اسناد کی وجہ سے شائع و مشہور ہے۔ امام بخاریؒ کی نادر باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے، مجھ کو امید ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے کسی شخص کی غیبت کا سوال نہ کیا جائے گا، کیوں کہ میں نے بفضل اللہ کسی کی غیبت نہیں کی۔ سبحان اللہ کس قدر تعفف اور تورع تھا (خدا تعالیٰ ہر مسلمان کو اس کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)

طریق صالحین کے مطابق امام بخاریؒ کو بھی محنت و ابتلاء یہ پیش آیا کہ خالد بن احمد ذہلی امیر بخارا نے ان کو اس امر کی تکلیف دینی چاہی کہ اس کے مکان پر آکر اس کے بیٹوں کو "جامع" "اور تاریخ" او ردوسری کتابوں کا درس دیں۔ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ یہ حدیث کا علم ہے، میں

اس کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم کو غرض ہے تو اپنے بیٹوں کو میری مجلس میں بھیج دیا کرو تاکہ دوسرے طلبہ کی طرح وہ بھی علم حاصل کریں۔ امیر نے کہا، اگر ایسا ہے تو جس وقت میرے بیٹے آپ کے پاس آئیں آپ دوسرے طلبہ کو اپنی خدمت میں نہ آنے دیں۔ میرے دربان اور چوب دار دروازے پر تعینات رہیں گے۔ میری نخوت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ جس مجلس میں میرے بیٹے موجود ہوں وہاں جولاہے، دھنیے بھی ان کے ہم نشین ہوں۔ امام بخاریؒ نے اس کو بھی قبول نہ کیا اور فرمایا کہ یہ علم، پیغمبر کی میراث ہے۔ اس میں ساری امت شریک ہے۔ کسی کو کوئی خصوصیت نہیں۔ اس گفت و شنید سے مذکورہ امیر امام بخاریؒ سے رنجیدہ ہوگئے۔ طرفین میں کدورت بڑھتی رہی۔ نوبت بایں جارسید کہ امیر مذکور نے ابن ابی الورقاء اور اس وقت کے دوسرے علمائے ظاہری کو اپنے ساتھ ملالیا اور امام بخاریؒ کے مسلک پر طعن کرنے لگے اور ان کے اجتہاد میں غلطیاں نکال کر ایک محضر تیار کرایا اور اس حیلے بہانے سے "بخارا" سے ان کو نکال دیا۔ امام بخاریؒ وہاں سے روانہ ہوئے تو انہوں نے جناب الٰہی میں دعا کی کہ اے اللہ ان لوگوں کو اس بلا میں مبتلا کر جس میں وہ مجھ کو کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی ایک ماہ بھی پورا گزرنے نہ پایا تھا کہ خالد بن احمد معزول ہوئے۔ خلیفہ کا حکم پہنچا کہ ان کو گدھے پر سوار کرکے شہر میں گھمائیں۔ انجامِ کار ان کو کامل تباہی کا سامنا ہوا، جیسا کہ کتاب تاریخ میں لکھا ہوا اور مشہور ہے۔ حریث ابن ابی ورقاء کو بھی بے حد رسوائی اور فضیحت کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کا وقار خاک میں مل گیا۔ نیز اس وقت کے ان علماء کو بھی جو امام بخاریؒ کے درپے تذلیل اور (خالد بن احمد ذہلی کے) مشورے میں شریک تھے، پوری پوری آفت پہنچی۔ امام بخاریؒ اس بے کسی کی حالت میں پہلے نیشاپور گئے۔ جب وہاں کے امیر سے بھی نہ بنی تو وہاں سے مراجعت کرکے خرتنگ تشریف لائے (یہ ایک گاؤں کا نام ہے جو سمرقند سے تین فرسخ (دس میل) کے فاصلے پر واقع ہے۔) سنہ ۲۵۶ھ میں انتقال ہوا۔ عید کے دن نمازِ ظہر کے بعد دفن کردیے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ امام بخاریؒ کی عمر ۶۲ سال کی ہوئی۔ چنانچہ کہا گیا۔ "ولد فی صدق وعاش حمیداً ومات فی نور"۔ اس جملے صدق کے اعداد ۱۹۴، ان کی پیدائش، حمید کے اعداد ۶۲، ان کی عمر اور نور کے اعداد ۲۵۶، ان کی وفات کا سال ظاہر کرتے ہیں۔

عبدالواحد طوسیؒ نے جو اس زمانے کے صلحا اور اکابر اولیاء میں سے تھے، خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ مع اپنے اصحابؓ کے برسر راہ منتظر کھڑے ہیں۔ انہوں نے سلام کرکے عرض کیا، یا رسول اللہ (ﷺ) کس کا انتظار ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا محمد بن اسماعیل امام بخاریؒ کا انتظار کررہا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس خواب کے چند روز بعد ہی میں نے امام بخاریؒ کی وفات کی خبر سنی۔ جب میں نے لوگوں سے وقت وفات کی تحقیق کی تو وہی ساعت معلوم ہوئی جس میں، میں نے حضور سرورکائنات ﷺ کو خواب میں منتظر دیکھا تھا۔ وقتِ شدت خوفِ دشمن، سختی مرض، قحط سالی اور دیگر بلاؤں میں اس جامع صحیح کا پڑھنا تریاق کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ اکثر اس کا تجربہ ہوچکا ہے۔

●●

امام بخاریؒ بچپن میں ہی نابینا ہوگئے تھے، اس وجہ سے ان کی والدہ کو اس کا سخت قلق رہتاتھا۔ اور وہ نہایت گریہ وزاری سے خدا تعالیٰ کی جناب میں ان کی بصارت کے لئے دعا کیا کرتی تھیں۔ ایک شب کو ان کی والدہ نے حضرت ابراھیم علیہ الصلوۃ والسلام کو خواب میں دیکھا، آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تیری گریہ و زاری اور دعا کے سبب تیرے فرزند کو بصارت عنایت فرمائی۔ جب وہ صبح کو اٹھیں تو اپنے لخت جگر کی آنکھوں کو روشن و بینا پایا۔

مولانا محمد الحسنیؒ

حضرت سید شاہ علم اللہؒ

ایک درویش اور عاشق رسول کی شخصیت کا مطالعہ

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ نے ایک مرتبہ ایک دلچسپ حکایت بیان فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چند آدمی ریل سے سفر کر رہے تھے وقت گزاری کے لئے انھوں نے ایک دوسرے کے حالات دریافت کرنے شروع کئے، موضوع یہ تھا کہ کون کس سے بیعت ہے، سب نے کسی نہ کسی کا نام لے لیا، قریب ہی ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو گفتگو میں حصہ نہیں لے رہے تھے اور بالکل خاموش تھے جب سب اپنے اپنے پیروں کا ذکر کر چکے تو ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ صاحب آپ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں آپ بھی تو بتائیے کہ آپ کا پیر کون ہے؟ ان صاحب نے بڑے اطمینان سے اپنے پیٹ سے کرتہ ہٹایا اور اس پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا کہ میرے پیر یہ ہیں۔

ہماری موجودہ دنیا کے متعلق آج جو بھی کہا جائے اور لکھا جائے اس میں شبہ نہیں کہ اس کا سب سے بڑا مذہب "نفس پرستی" اور اس کا سب سے بڑا پیر "شکم" ہے اور یہ ایسا بین الاقوامی پیر ہے کہ اس کا حلقۂ ادارت مشرق و مغرب اور عرب و عجم، ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اور اس کا سکہ ہر ملک میں رواں ہے اس نے بہت سے چھوٹے چھوٹے پیروں مثلاً قومیت، آمریت، رنگ و نسل اور زبان و وطن کے پجاریوں کو اپنی بساط بچھانے اور اپنا حلقہ بنانے کی اجازت ضرور دے رکھی ہے لیکن اس شرط پر کہ سب اس کے ماتحت بن کر رہیں اور اسی سے "کسب فیض" کریں اور ہر فائدہ و آمدنی میں اس کو مقدم رکھیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سوسائٹی کی نظروں سے وہ معیار او جھل ہو گئے ہیں جو اس ہمہ گیر مذہب اور اس کے سب سے بڑے پادری یا پروہت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے تھے اور اس کے سارے اثرات (جس کو ہم اپنی نئی زبان میں معیار زندگی کی بلندی، بہتر اقتصادیات، مادی ترقی اور معاشی خوش حالی جیسے خوش نما ناموں سے تعبیر کرتے ہیں) سے آزاد ہو کر اپنے عمل سے یہ اعلان کرتے تھے کہ انسانیت صرف اچھا کھانے، اچھا پہننے اور اچھے مکان میں رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جس کی تکمیل قدر و شکر گزاری اور اطمینان کے ساتھ ہونی چاہئے بچوں کی طرح اس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا، فاقہ زدوں کی طرح اس پر گرنا اور اس کو پا کر اپنے کو کھو دینا انسان کے جوہر عالی اور اس کی بلند استعداد کی سخت ناقدری اور توہین ہے۔

یہ انسانی معیار جو خدا کے فضل سے ہر زمانہ میں اور ہر جگہ پائے جاتے تھے اس زمین میں خدا کی نشانی بن کر اور انسانوں کے جنگل میں پرچم کی طرح بلند ہو کر اس بات کی دعوت دیتے تھے کہ اپنے کو اس نفس کی غلامی اور اس شکم کی اسیری سے آزاد کرو جس کی وجہ سے خدا کی ایک مخلوق گائے بیل اور سور کتے کے ذلیل نام سے پکاری جاتی ہے اور جس کے سامنے صرف دو چیزیں ہوتی ہیں اپنی خواہش اور اپنا پیٹ۔

نفس پرستی اور شکم پرستی اور اس کے نتیجہ میں مادیت و حیوانیت کی تاریک گھٹاؤں نے جب کبھی کسی ملک اور معاشرہ یا کسی آبادی اور قبیلہ کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے اس وقت اللہ کے مخلص و مقبول بندوں اور عالی ہمت و بلند حوصلہ انسانوں نے دنیا کے رواج و دستور، انسانوں کے قیاس و تجربہ، رائج الوقت معلومات و مسلمات اور ہوا کے رخ کے خلاف ایک ایسے طرز زندگی اور ایسی سطح کا نمونہ پیش کیا جس میں خزف ریزوں اور ٹھیکروں اور روپیوں اور اشرفیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا تھا اور شاہ و گدا سب برابر ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ جو رویہ اور برتاؤ تھا وہ صرف اللہ کے حکم، شریعت کے فیصلے اور سنت نبویؐ کی روشنی و رہنمائی میں تھا۔

انسانیت کے ان اعلیٰ نمونوں نے (جو اس زمین کی برکت اور پوری انسانیت کی قابل فخر دولت ہیں) اس نفس پرستی اور شکم کی بالادستی اور حکمرانی پر ہمیشہ سخت ضرب لگائی اور یہ بتایا کہ کام و دہن کی لذت اور خواہشات نفس کی تکمیل سے بڑھ کر ایک اور لذت ہے، جس کا مزہ چکھنے کے بعد آدمی ان حقیر اور فانی لذتوں کی طرف مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتا، البتہ اس کا مزہ چکھنے سے پہلے کچھ قربانی ایثار اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت سید شاہ علم اللہ حسنیؒ (م ۱۰۹۶ھ) کی زندگی سے ہمیں پہلا سبق یہی ملتا ہے اور یہ وہ سبق ہے جس کو اس دور ہوس اور دور شکم میں پوری بلند آہنگی کے ساتھ اور بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت اور گویا ان کی سیرت کا عنوان اتباع سنت بلکہ سنت سے عشق ہے، بدعت کی ہر قسم بلکہ اس کا سایہ بھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھا اور ایک چھوٹی سی چھوٹی سنت ان کے نزدیک بڑی بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں سے کہیں افضل تھی، سنت کا شوق اور اہتمام بچپن سے ان کے خمیر میں تھا اور شاید ہی کوئی وقت ایسا گزرتا ہو کہ کوئی سنت ان سے ترک ہو جاتی ہو یہاں تک کہ وہ لوگ جن پر ان کا کچھ سایہ پڑ گیا سنت کے دلدادہ ہو گئے اور ان کے رنگ میں رنگ گئے اور جہاں گئے اور جہاں رہے اسی رنگ پر قائم رہے، ان کی سیرت کے مطالعہ سے ہمارے دل میں سنت کی محبت اور عظمت بڑھتی ہے اور یقین پیدا ہوتا ہے کہ پیروی سنت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی دولت نہیں اور ایک چھوٹی سے چھوٹی سنت سے جو برکت اور ترقی حاصل ہوتی ہے وہ بڑے بڑے مجاہدوں، ریاضتوں اور قربانیوں سے بھی ہاتھ نہیں آتی۔

اس لئے ہماری بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہم اس آسان نبوی راستہ کو چھوڑ کر یا اس سے غفلت برت کر اپنی پسند اور اپنے ذوق سے دوسرے راستوں اور دوسرے طریقوں پر اپنی اصل قوت اور اصل توجہ مرکوز کر دیں اور پیروی سنت کا حصہ ہماری زندگی میں کم سے کم ہو، موجودہ دور میں سنت کا اہتمام (خاص دینی حلقوں میں بھی) جتنا کم ہو چکا ہے اور برابر کم ہو رہا ہے اور بدعات کا جتنا رواج ہے اس کے پیش نظر ایسی چیزوں کی اشاعت یا ایسی کوئی کوشش جن سے لوگوں کے دلوں میں اتباع سنت کا شوق اور بدعت کی نفرت پیدا ہو فائدہ سے خالی نہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے کیسی عظیم اور عجیب و غریب صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور کیسے کیسے مقامات اور درجات اس کی زد اور دسترس میں ہیں اور اگر خدا کی توفیق شامل حال ہو اور وہ ایک دفعہ ہمت کر کے نفس کی بندش یا کشش ثقل سے آزاد ہو جائے تو کیسے کیسے عالم، کیسی کیسی لذتیں بلکہ کیسی کیسی جنتیں اس دنیا ہی میں اس کی منتظر ہیں لھم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا وفی الاخرۃ (ان کے لئے دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک عارف اور حقیقت شناس نے فرمایا تھا: "لو علم الملوک ما نحن فیہ لقاتلونا بالسیوف" (اگر بادشاہوں کو خبر لگ جائے کہ ہم لوگ کس مزے میں ہیں تو (رشک وحسد سے) تلواریں لے کر ہمارے مقابلہ پر آجائیں) اور اس میں ادنیٰ تعجب اور مبالغہ کی بات نہیں، جب صرف مادی وسائل کو ترقی دے کر آدمی ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑ سکتا ہے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیر سکتا ہے اور ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے اور جب ایک انسان محض اپنے جسم کو ترقی دے کر مشق و ریاضت بہم پہنچا کر اور خود اعتمادی اور خود شناسی کے ذریعہ جسمانی شعبہ میں حیرت انگیز کمالات دکھا سکتا ہے اور ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے تو

کیا یہ انسان اپنے دل اور روح کی صلاحیتوں اور مخفی طاقتوں کو بروئے کار لا کر ان مقامات تک نہیں پہنچ سکتا جن کے سامنے یہ سارے دنیاوی کمالات اور مادی ترقیات وعجائبات بچوں کے کھیل یا مٹی کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

حضرت شاہ سید علم اللہؒ کی سیرت سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا شناسی وخود شناسی کی بدولت ایک ظلوم وعاصی انسان کہاں سے کہاں پہنچتا ہے، کس طرح مٹی سے سونا بنتا ہے، ذرہ سے آفتاب بنتا ہے، کس طرح اس دنیا میں رہ کر دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے، کس طرح اس دنیا میں جنت کے مزے لوٹتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دل پر خدا کی "نظر کرم" دیکھتا ہے اور اس کے انعامات، نوازشوں، بشارتوں اور خوش خبریوں سے خوش اور سرفراز ہوتا ہے۔

کس طرح اس کی مخلوق کے لئے فیض وسخاوت کا سمندر بن جاتا ہے اور کس طرح اس کے انوار وبرکات سے، آشنا وبیگانہ، دوست ودشمن اور قریب وبعید اپنی اپنی استعداد اور ظرف اور توفیق الٰہی کے بقدر مستفید ہوتے ہیں اس کی ذات خلائق کے لئے مرکز ومرجع بن جاتی ہے اور اس کے اثرات زمانہ اور مسافت کے پردوں کو چیرتے ہوئے آنے والی نسلوں تک پہنچتے ہیں۔

کس طرح اس کی دعاؤں سے مصیبتیں ٹلتی ہیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں اور اس کا وجود رحمت وسکینت کی چادر بن کر پورے ماحول پر محیط ہو جاتا ہے، کس طرح اس کی محبت انسانوں کے دل میں ڈال دی جاتی ہے اور وہ کشاں کشاں اور افتاں وخیزاں اس کے پاس پہنچتے ہیں اور دیوانہ وار وبے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھامتے ہیں اور اس کے پیچھے چلنا اپنی سعادت جانتے ہیں اور اس کی ہر جنبش لب اور ہر نگاہ غلط انداز کو باعث افتخار اور سرمایۂ امتیاز سمجھتے ہیں اور زبان حال سے گویا ہوتے ہیں۔

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

کس طرح وہ چھپنا چاہتا ہے اور چھپ نہیں سکتا، دنیا سے منہ موڑتا ہے اور دنیا اس کے قدموں پر گرتی ہے، امراء وبادشاہوں سے دور رہنا چاہتا ہے اور وہ اس کی تلاش میں پیچھے پیچھے گھومتے ہیں، کس طرح وہ خویش واقارب اور خاندان وقبیلہ کے حدود کو پار کر کے پوری انسانیت کا سرمایہ، زمین کی زینت اور دنیا والوں کے لئے برکت بن جاتا ہے۔

سید شاہ علم اللہؒ کی زندگی کے مطالعہ سے انسان میں وہ جوہر خوابیدہ اور وہ مبارک خلش بیدار ہونے لگتی ہے جو خدا نے ہر انسان میں ودیعت کی ہے، اس کے اندر خدا طلبی اور خودشناسی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کی ہمت بندھتی ہے اور امید بڑھتی ہے اس میں یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی اس راستہ پر چل کر ان مقامات تک پہنچے اور وہ مرتبہ حاصل کرے جو اگر پوری عمر اور پوری دنیا بیچ کر بھی مل جائے تو بہت ارزاں ہے بلکہ محض توفیق الٰہی اور رحمت خداوندی ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اس پست ہمتی، تن آسانی، عافیت طلبی اور نیک کاموں میں قناعت پسندی کے دور میں اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ تمام انسانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے سامنے ایسی عملی مثالیں پیش کی جائیں جن سے ان میں اولوالعزمی، حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کے اوصاف پیدا ہوں اور وہ یہ سمجھیں کہ وہ کتنی بڑی دولت کی ناقدری کر رہے ہیں اور کیسے کیسے خزانوں اور طاقت کے سرچشموں کو وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے بیٹھے اور خدا کے لافانی خزانوں، اس کے لازوال انعامات اور سب سے بڑھ کر اس کی نظر کرم اور نظر محبت کے مقابلہ میں کیسے فانی، عارضی، زودرنج، بے مروت، بے وفا اور طوطا چشم آسروں کا سہارا لئے ہوئے ہیں اور کائنات کی کتنی حقیر اور چھوٹی کسر پر قناعت کئے بیٹھے ہیں۔

❖❖

مظاہر قدرت

محترم ملک احمد سرور
مدیر ماہ نامہ بیدار ڈائجسٹ، لاہور

پانی۔ نعمتِ ربِ جلیل

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان گنت نعمتیں عطا کی ہیں اور ہر نعمت بے مثال ہے۔ دماغ، زبان، آنکھ، کان، دل...... کسی کا کوئی نعم البدل نہیں۔ آکسیجن ایسی نعمت ہے جس کے بغیر انسان چند لمحات بھی زندہ نہیں رہ سکتا مگر پانی وہ نعمت ہے جس سے انسان ہی نہیں ہر ذی روح کی تخلیق ہوئی۔ سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا" اور پھر ہر ذی روح کی نسل پانی ہی کے ذریعے آگے چلی۔ "پھر اس کی نسل آگے چلی۔ نسل انسانی کے حوالے سے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "پھر اس کی نسل ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔"

انسان کی آبادکاری میں بھی پانی کا بڑا حصہ ہے۔ غور کریں تو کرۂ ارض کی تمام آبادیاں اور شہر مکہ اس وقت آباد ہوا جب وہاں آب زم زم کا چشمہ پھوٹا۔ آج زمین کے باہر سیاروں کی تلاش میں پانی ہی کو اولیت حاصل ہے۔ سائنس دانوں کا اتفاق ہے کہ جس سیارے پر بھی پانی ہو، وہاں زندگی بھی ہوگی اور وہاں انسان کو لے جا کر بسایا جا سکتا ہے۔

کرۂ ارض کا تین چوتھائی پانی پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود پانی کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ ملکوں کے مابین اور خود ملکوں کے اندر مختلف اکائیوں (صوبوں وغیرہ) میں پانی پر جھگڑے چل رہے ہیں۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ان جھگڑوں میں آئندہ عشروں میں مزید شدت پیدا ہوگی اور بعض کا تو خیال ہے کہ تیسری عالمی جنگ شاید پانی ہی کے مسئلے پر چھڑے۔ دریا ہوں یا سمندر یا خلیجیں، ہر ملک کا مفاد ان سے وابستہ ہے۔ جب بھی کسی ملک نے کسی دوسرے کے پانی کو روکنے کی کوشش کی تو جنگ یقینی ہے۔ پانی کے حوالے سے مختلف اعداد وشمار اور قرآنی آیات سے پہلے ہارون یحییٰ کی ایک انگریزی تحریر کی تلخیص ذیل میں ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں نے پانی کی نادر خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے:

ہمارے سیارے (زمین) کا بڑا حصہ پانی کی لپیٹ میں ہے اور سمندروں کا رقبہ کرۂ ارض کا ۷۵ فیصد ہے جب کہ خشکی پر بھی ان گنت دریا، نالے، ندیاں اور جھیلیں ہیں۔ بلند وبالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر منجمد پانی برف کی صورت میں موجود ہے۔ زمینی پانی کی ایک خاصی مقدار کروڑوں ٹن بخارات اور بادلوں کی صورت میں فضا میں معلق ہے۔ وہ ہوا جو سانس کے ذریعے ہم نکالتے ہیں، اس میں بھی پانی موجود ہوتا ہے۔ پھر زمین پر پانی کا بڑا ذخیرہ ہے۔ زمین پر آپ جدھر نظر ڈالیں آپ کو ہر طرف کسی نہ کسی صورت میں پانی نظر آئے گا۔ بذاتِ خود آپ کا اپنا جسم ۴۰ تا ۵۰ لیٹر پانی رکھتا ہے۔ انسانی جسم کا تقریباً ۷۰ فیصد پانی ہے۔ انسانی جسم کے خلیات میں بے شمار چیزیں ہوتی ہیں، مگر پانی سب سے اہم اور زیادہ ہوتا ہے۔ خون پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ پانی ہی پر مشتمل ہے۔ تمام زندہ اشیا کا بڑا حصہ پانی پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ہر زندہ چیز ۷۰ یا ۷۵ فیصد پانی رکھتی ہے۔ فصلوں، پودوں، کیڑے مکوڑوں سب پر غور کرلیں، بعض میں تو ۷۵ فیصد پانی رکھا تو ہر زندہ چیز کے لئے بھی تقریباً یہی تناسب مقرر فرمایا۔ اس میں معمولی سی کمی بیشی مشکلات پیدا کر دیتی ہے اور بعض اوقات موت بھی ہو جاتی ہے۔ ہیضہ اور ایسی دیگر بیماریوں میں موت کی وجہ پانی کی کمی ہے اور ہر سال لاکھوں بچے محض پانی کی کمی کے باعث مر جاتے ہیں۔ مٹی میں پانی کا تناسب ایک خاص حد سے نیچے گر جائے تو وہ مردہ ہو جاتی ہے، وہاں کی فصلیں اور پودے سوکھ جاتے ہیں۔

پانی وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر "حیات" ہی کے لئے بنایا ہے۔

اس کی ہر کیمیائی اور طبعی خاصیت "زندگی" ہی کے لئے ہے مثلاً اس کے طرزِ انجماد پر غور کریں۔ جتنے بھی دیگر مائعات ہیں وہ پیندے (Bottom) سے جمنا شروع ہوتے ہیں مگر پانی اوپری سطح سے جمنا شروع ہوتا ہے۔ یہ اس کی ایک غیر معمولی خصوصیت ہے اور زمین پر پانی کا وجود محض اسی خاصیت کے باعث ہے۔ اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی یعنی اگر برف سطحِ آب پر نہ تیرتی تو ہمارے سیارے پر پانی کا بڑا حصہ برف بن کر رہ جاتا، بیشتر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں اور تالابوں میں زندگی ناممکن ہو جاتی۔

کرۂ ارض پر بڑی جگہیں ایسی ہیں جہاں سردیوں میں درجۂ حرارت صفر درجہ سینٹی گریڈ سے نیچے چلا جاتا ہے اور بعض جگہوں پر بہت زیادہ نیچے۔ سردی کی یہ شدت یقیناً سمندروں اور دریاؤں کے پانی کو متاثر کرتی ہے۔ پانی سرد سے سرد تر ہوتے ہوئے جمنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر جما ہوا پانی یعنی برف اپنی موجودہ خاصیت (سطحِ آب پر تیرنے کی) نہ رکھتی تو یہ ڈوبتی ہوئی دریا اور سمندر کے پیندے کی طرف چلی جاتی اور نسبتاً پانی کا گرم حصہ اوپر آ جاتا۔ جہاں فضا میں موسم بدستور شدید سرد ہوتا یعنی نقطۂ انجماد والا یا اس سے بھی نیچے۔ یہ پانی بھی منجمد ہو کر ڈوبتا ہوا پیندے میں چلا جاتا۔ جتنا عرصہ فضا کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا، پانی کے برف بننے اور ڈوبنے کا عمل غیر معمولی خاصیت کے باعث ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جوں جوں سردی بڑھتی ہے، پانی بھاری ہو کر تہہ کی طرف جانا شروع ہو جاتا ہے اور گرم پانی اوپر۔ یہ سلسلہ ۴ ڈگری سینٹی گریڈ تک جاری رہتا ہے۔ اس درجۂ حرارت پر پانی کی غیر معمولی خاصیت کے باعث غیر معمولی تبدیلی آتی ہے۔ بجائے اس کے کہ درجۂ حرارت گرنے سے دیگر اشیاء اور مائعات کی طرح پانی مزید سکڑے اور بھاری ہو، مزید درجۂ حرارت کم ہونے سے یہ پھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ۴ سینٹی گریڈ والا پانی بھاری ہونے کے باعث نیچے رہتا ہے اور وہ پانی جس کا درجہ حرارت ۴ سینٹی گریڈ سے کم ہے اوپر کی سطح پر۔ یعنی اگر دریا یا سمندر کے پیندے پر درجہ حرارت ۴ سینٹی گریڈ ہے تو اس کے اوپر ۳ سینٹی گریڈ، اس کے اوپر کی تہہ برف بن جاتی ہے۔ یعنی صرف اوپر کی سطح کا پانی منجمد ہوگا اور برف کے نیچے ۴ سینٹی گریڈ والا حصہ پانی رہے گا جس میں سمندری پودے اور دیگر مخلوقات زندہ رہیں گی۔

پانی کی ایک اور خاصیت پر غور کریں۔ برف میں انتقالِ حرارت کی رفتار بہت کمزور ہے یعنی برف ایک کمزور اور ادنیٰ قسم کا موصل ہے۔ یہ صفت بھی برف کی تہہ کے نیچے پانی کو پانی رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ برف کی تہہ پانی میں موجود حرارت کو فضا کی طرف نہیں بھاگنے دیتی جس سے پانی گرم رہتا ہے۔ یہ اسی صفت کا نتیجہ ہے کہ فضا کا درجۂ حرارت منفی ۵۰ ڈگری سینٹی گریڈ بھی ہو جائے تو پھر بھی سمندر میں برف کی تہہ بہ مشکل ایک سے دو میٹر موٹی ہوگی اور اس میں فریکچر بھی ہوں گے۔ پانی کی اسی صفت کے باعث قطبین میں سیل مچھلی اور پینگوئن برف کی تہہ کے نیچے پانی میں رہائش رکھتے ہیں۔

ایک بار پھر سوچیں کہ اگر پانی یہ غیر معمولی خاصیت نہ رکھتا اور دیگر مائعات ہی کی طرح عمل کرتا یعنی درجۂ حرارت گرنے کے ساتھ ساتھ وہ سکڑتا اور بھاری ہو کر سمندر یا دریا کے پیندے میں بیٹھ جاتا جیسا دوسرے مائعات میں ہوتا ہے، تو کیا ہوتا؟ اس صورت میں سمندروں اور دریاؤں میں انجماد کا عمل پیندے سے شروع ہوتا اور بتدریج اوپر کی سطح پر آتا اور حرارت کے فضا کی طرف انتقال کو روکنے کے لئے سطح پر چند میٹر پانی کی تہہ بچ پاتی۔ فضا کا درجہ حرارت بڑھ بھی جاتا تو سمندروں کے پیندے میں جمی ہوئی برف کبھی بھی مکمل طور پر پگھل نہ پاتی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ سمندری حیات کی بقا ممکن نہ رہتی بلکہ خشکی پر بھی زندگی کے آثار کم ہی نظر آتے۔ بہ الفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے پانی میں یہ غیر معمولی صفت نہ رکھی ہوتی تو کرۂ ارض بھی ایک مردہ سیارہ ہوتا۔

۴ سینٹی گریڈ سے نیچے درجۂ حرارت گرتے ہی پانی کیوں پھیلنا شروع ہو جاتا ہے، اس کا تا حال کوئی جواب نہیں دے سکا، سوائے اس کے کہ یہ پانی کی اپنی غیر معمولی خاصیت ہے کہ ۴ سینٹی گریڈ سے کم درجہ حرارت پر اس کے مالیکیول ایک دوسرے سے قریب

ہونے کے بجائے دور ہونے لگتے ہیں جب کہ دیگر مائعات میں اس کے الٹ ہوتا ہے۔

پانی کا زمین میں اتر جانا

اللہ تعالیٰ نے پانی کو اتنی مقدار میں بنایا ہے جتنی اس کی ضرورت ہے۔ پھر اس کو مقررہ مقدار میں رکھنے کے لئے ایسا چکر (سائیکل) شروع کیا کہ اس میں کمی بیشی نہ ہو مثلاً پانی گرم ہو کر بخارات میں تبدیل ہوگا تو بارش کی صورت میں پھر واپس آ جائے گا، برف بنے گا تو گرمیوں میں دوبارہ پانی بن جائے گا۔ انسان، حیوان اور نباتات جتنا پانی استعمال کرتے ہیں، مجموعی طور پر اتنا ہی واپس کرتے ہیں تو پھر پانی کی کمی کا رونا کیوں؟ اصولاً پانی میں کوئی کمی نہیں آنی چاہئے۔ اب پانی کم ہو رہا ہے تو پھر کدھر جا رہا ہے۔ کیا پانی اس قدر طاقت ور ہو گیا ہے کہ زمین کی کشش ثقل کی زنجیروں کو توڑ کر خلاؤں میں چلا جائے۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں تو پھر پانی میں جو کمی آ رہی ہے، وہ کیسے آ رہی ہے اور کم ہونے والا پانی کہاں غائب ہو رہا ہے؟ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

"اور ہم نے آسمان سے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں، غائب کر سکتے ہیں۔" (المومنون:۱۸)

مزید فرمایا: "جس (اللہ) نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو جلا اٹھایا۔" (الزخرف:۱۱)

آئے دن تحقیق کاروں کی رپورٹیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں کہ زیرِ زمین پانی بتدریج نیچے جا رہا ہے۔ اگر پانی کی سطح گرنے کی یہی رفتار رہی تو بہت جلد ہم لوگ پینے کے پانی سے محروم ہو جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر زیرِ زمین پانی ایک جگہ کم ہو رہا ہے تو دوسری جگہ بڑھنا چاہئے، مگر ایسی کوئی رپورٹ نہیں کہ لاہور میں پانی کی سطح گر گئی ہے اور شیخوپور میں بڑھ گئی ہے یا فلاں جگہ پانی زیادہ ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پانی کی سطح کا گرنا بھی قدرت کی طرف سے ہے اور ہمارے نامۂ اعمال کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے، پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔" (الکہف:۴۱)

مزید فرمایا: "کیا کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا۔" (الملک ۳۰)

کرۂ ارض پر پانی کے اعداد و شمار

پانی کے ماہرین نے جو اعداد و شمار ترتیب دئے ہیں اور کرۂ ارض میں مختلف صورتوں میں موجود پانی کی مقدار کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے، ان ماہرین کے مطابق دنیا بھر میں ۱.۴۵۴ بلین کلو میٹر کیوبک پانی موجود ہے۔ اس میں ۹۷.۵ فیصد پانی کھارا ہے اور یہ بنیادی طور پر سمندروں میں موجود ہے جب کہ تازہ پانی کی مقدار ۲.۵ فیصد ہے۔ دنیا بھر میں پائے جانے والے پانی کے اس تخمینے میں وہ پانی شامل ہے جو فلک بوس گلیشیرز اور زیرِ زمین یا فراسٹ (مستقل جمے ہوئے پانی) کی شکل میں موجود ہے۔

ماہرین کے خیال میں کرۂ ارض کی خشکی پر تین میل کی بلندی تک ہر جانب پانی ہی پانی ہوگا۔ ماہرین کے تخمینے کے مطابق پاکستان میں موجود پانی ۱۰۵ ملین ایکڑ فیٹ ہے۔ اس میں ۹۵ فیصد پانی آب پاشی اور زراعت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جب کہ عالمی سطح پر زراعت کے لئے پانی کا مجموعی طور پر ۷۰ فیصد حصہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا بھر میں موجود پانی کا ۲۰ فیصد حصہ صنعتی ضرورتوں پر صرف ہوتا ہے جب کہ بقیہ ۱۰ فیصد پانی پینے کی ضرورتوں کے لئے استعمال میں آتا ہے۔

ارضی کتب سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق کرۂ ارض پر پانی کے ذخیروں کا تخمینہ اس طرح ہے:

(۱) سمندروں میں
۱۰ نیل ۶۰ کھرب ۱۱ ایکٹر فیٹ

(۲) فضا میں
۳ نیل ۳۰ کھرب ۱۱ ایکٹر فیٹ

(۳) قطبین کی برف
۲۳ نیل ۴۶ کھرب ۱۶۸ ایکٹر فیٹ

(۴) جھیلوں میں
ایک کھرب، ایک ارب ۱ ایکٹر فیٹ

(۵) دریاؤں میں ۹۳ کروڑ ا یکٹر فیٹ

(۶) مٹی کی نمی میں ۲۰ ارب ۴۰ کروڑ ا یکٹر فیٹ

(۷) زیرِ زمین
۸۲ کھرب ۱۳ ارب ۱ یکٹر فیٹ

(۸) درختوں اور حیوانات میں
۸۲ کھرب ۱۳ ارب ۱ یکٹر فیٹ

●●